رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

نگار

قیمت

۸ر

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت دو روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۳۲۔ افسانے ۱۹۳۳ء تک کے درج ہیں۔ زبان قدرت بیان علو تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے

قیمت چار روپیہ (للعہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں مع تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ)

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اُصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشا رعالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

اُردو شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۵ء کا نگار جس میں اُردو شاعری کی تاریخ، اس کی عہد بہ عہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعرا پر بسیط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے مع انتخاب کلام، اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور جس میں سات مضامین اڈیٹر نگار کے لکھے ہوئے ہیں حجم ۲۵۶ صفحات۔ قیمت عہ علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۶ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہو اس میں تمام مشہور ہندو شعرا کے کلام کا انتخاب مع ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اُردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

"نگار" جنوری ۱۹۳۷ء

(۱) "ڈرامہ اصحاب کہف"۔ یہ ڈرامہ مصری انشا پرداز توفیق الحکیم کی کتاب "اہل الکہف" سے ماخوذ و مقتبس ہے اور تنہا یہی ایسی چیز ہے جو آپ کے ذوق انشا و تمثیل کو آسودہ کرنے والی ہے۔ اس کے علاوہ (۲) اسکر وائلڈ کے خطوط جو اُس نے سارہ (مشہور ایکٹرس) کو لکھے تھے اور جو دنیائے ادب و انشا میں خاص مرتبہ کی چیز سمجھے جاتے ہیں۔ وائلڈ اپنے طرز انشا و ندرت بیان کے لحاظ سے یورپ میں جس مرتبہ کا شخص شمار ہوتا تھا اسکا اندازہ آپ ان خطوں سے کر سکتے ہیں (۳) مسئلۂ خلافت و امامت" (آزاد خیال شیعی کے قلم سے) مسئلہ خلافت و امامت لاکھ قدیم و لاینحل سہی پھر بھی اس سلسلۂ تحقیق و جستجو میں بعض ایسی باتوں کے نکلنے کا امکان ہے جن سے مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہو سکے چنانچہ اس سلسلہ کا یہ پانچواں مقالہ ہے اسکے بعض عنوان یہ ہیں:۔ مسئلۂ خلافت کے مبادی مقدمات۔ نفس مسئلۂ خلافت۔ مسئلۂ خلافت کے فروع و جزئیات وغیرہ ——— صفحات ۱۴۴ ——— قیمت عہ علاوہ محصول

مجموعۂ استفسار و جواب حصۂ سوم تیار ہے

اور

اسکی روانگی ۱۵ مارچ سے شروع ہوجائیگی

جن اصحاب کے پاس اس کا پہلا اور دوسرا حصہ موجود ہے اُن کو تیسرا حصہ بھی یقیناً تکمیل جلد کے لئے درکار ہوگا اس لئے حسب دستور سابق تیسرا حصہ بھی اُنکے نام ذریعہ وی پی عہ (رعایتی قیمت میں) روانہ کیا جائے گا۔ اگر کسی ناگزیر سبب کی بنا پر فی الحال اسکی خریداری ممکن نہ ہو تو براہ کرم بیرنگ کارڈ کے ذریعہ سے ہم کو اطلاع دیجئے۔

منیجر نگار

جلد ۳۳	فہرست مضامین مارچ ۳۸ء	شمار ۳

ملاحظات ---------------------------- ۲ --- ۸

فلسفہ کیا ہے؟ ------ مرزا محبوب بیگ ------ ۹ --- ۱۸

ادبیات ---------------------------- ۱۹ --- ۲۹

سیاسیات یوروپ ---------------------------- ۳۰ --- ۳۹

اُردو غزل ------ فراق گورکھپوری ------ ۴۰ --- ۵۴

مکتوبات نیاز ---------------------------- ۵۵ --- ۵۸

باب الاستفسار ---------------------------- ۵۹ --- ۶۱

منظومات ------ پنڈت انندنراین ملا ـ فضل الدین اختر ------ ۶۲ --- ۶۴

اسلامی ہند ---------------------------- ۱۳۹ --- ۱۵۰

نغمۂ کارواں ---------------------------- ۱۳ --- ۱۶

اصلی برقی قوام (تمباکوئے خوردنی قیمتی فی تولہ ۴؍) صرف شیخ خورشید علی پرفیومر نظیر آباد لکھنؤ کے پتہ سے ملسکتا ہے

نگار

اڈیٹر :- نیاز فتحپوری

معاون :- جلیل اعظمی

جلد ۳۳	مارچ سنہ ۳۸ء	شمار ۳

ملاحظات

افق کانگرس سے ایک نئے آفتاب کا طلوع

کانگرس ۱۹ فروری سنہ ۳۸ء کو دوسری نصف صدی کے پہلے سال میں قدم رکھتی ہے اور اس کا آغاز سوبھاس چندر بوس کے خطبۂ صدارت سے ہوتا ہے۔ وہ خطبۂ صدارت جس میں ایک روح ہے بالکل نئی، ایک قوت ہے مستحکم اور جس میں ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ ہے اٹل اور ہو کر رہنے والا --- یوں تو کانگرس کی آفرینش سے اسوقت تک اس کا جو قدم اُٹھا ہے وہ آگے ہی کی طرف اُٹھا ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اب وادی کے خارزار سے گزر کر اس نے پہاڑ کی بلندی کی طرف اپنا رخ پھیر دیا ہے اور وہ اُن سنگہائے گراں کو بھی ہٹانے کے لئے آمادہ ہوگئی ہے جن کا ہٹانا چوٹی تک پہونچنے کے لئے ضروری ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو کی گزشتہ دو سالہ صدارت کانگرس کے زمانہ میں جو کچھ ہوا وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ کانگرس نے نصف صدی کے اندر جو بیداری رفتہ رفتہ ملک میں پیدا کی تھی اس کی تشکیل پنڈت نہرو ہی کے زمانۂ صدارت میں ہوئی اور انھیں کی کوششوں سے ہندوستان کے روشن مستقبل کا ہیولیٰ مرتب ہوا۔ میں گزشتہ دو سال کے تمام واقعات کو دُہرانا ضروری نہیں سمجھتا

کیونکہ ان کا علم ہر شخص کو حاصل ہے اور سات صوبوں میں کانگرس کی حکومت کا قیام ایسا کھلا ہوا ثبوت پنڈت نہرو کی کامیابی صدارت کا ہے کہ اس سے زیادہ روشن دلیل کوئی اور پیش نہیں کی جاسکتی، لیکن یہ کہنا کہ سب کچھ سابق صدر کے ذاتی ولولہ و حوصلے کے مطابق ہوا، غالباً درست نہیں۔ وہ سوشلسٹ جماعت کے لیڈر ہیں۔ انھوں نے کبھی اس کو پسند نہیں کیا کہ آئین جدید پر کس نہج سے عمل کیا جائے کانگرس کی طرف سے تشکیل وزارت کے وہ ہمیشہ مخالف رہے اور ابتدا ہی سے آئین جدید کو ملک و قوم کی توہین قرار دیکر اس سے جنگ کرنے پر اصرار کرتے رہے، لیکن چونکہ اکثریت ان کی ہم خیال نہ تھی اس لئے انھوں نے اپنے نصب العین کو پس پشت ڈالکر انھیں خطوط پر قدم اُٹھایا جو گاندھی جی کے ٹھنڈے دل و دماغ نے متعین کر دئے تھے۔ پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے، کانگرس نے وزارتیں قبول کیں، اصلاحات کا آغاز ہوا، زراعت پیشہ طبقہ کے درد دُکھ دور کرنے کی تدبیریں سوچی جانے لگیں، تعلیمی دائرہ کو زیادہ وسیع و سہل الحصول بنانے پر غور ہونے لگا، زبان و قلم کی گرہیں کھُل گئیں اور سیاست مستبدہ کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔

پھر اگر ہندوستان کو صبر کرنے کا یارا ہو اور غلامی کی زنجیریں آہستہ آہستہ ٹوٹنے کا انتظار ناقابل برداشت نہ ہو تو موجودہ رفتار یقیناً ہندوستان کو ایک ربع صدی کے اندر "ڈومی نین ہوم رول" کی منزل تک پہونچا سکتی ہے جو غالباً گاندھی جی کا انتہائی نقطۂ نظر ہے لیکن یہاں کی سوشلسٹ جماعت جو پانی سر سے گزرتا ہوا دیکھ کر بیتابانہ ہاتھ پاؤں چلانے ہی کو صحیح طریق کار قرار دیتی ہے اور جو سیلاب کے رحم پر اپنے آپ کو چھوڑنے کے لئے طیار نہیں، کچھ اور چاہتی ہے، وہی کچھ جو انسانی خودداری نے ہمیشہ چاہا ہے اور جس کے لئے بڑی سی بڑی قربانی بھی ارزاں سودا سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ کانگرس اور وزارت کانگرس میں داہنے ہاتھ کو ہمیشہ بائیں ہاتھ سے یہی شکایت رہی کہ وہ سہولت سے کام کرنے میں حرج پیدا کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ آخر کار یوپی اور بہار کی کابینہ کو مجبور ہو کر سیاسی قیدیوں کی آزادی کے لئے وہ قدم اُٹھانا پڑا جو مرکزی حکومت کے لئے ناقابل قبول تھا اور اس طرح سوشلسٹ جماعت بالآخر اضطراب پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

پھر یہ بھی حُسنِ اتفاق ہے کہ اسی زمانہ میں کانگرس کی عنانِ حکومت مسٹر سوبھاش بوس کے ہاتھ میں آئی جو ظاہر و باطن بالکل سوشلسٹ ہیں اور جن کا خطبۂ صدارت اگر اس کو دلیل راہ بنایا جائے دفعتاً ہوا کا رُخ بدل سکتا ہے۔ مسٹر سوبھاش بوس کی زندگی کا بڑا حصہ یوروپ و سیاسیات یوروپ کے مطالعہ میں بسر ہوا اور اس لئے وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ صرف ایک ہندوستان کے مسئلہ نے دُنیا کو کتنا دُکھ پہونچا رکھا ہے اور جب تک یہ آزاد نہ ہو کرۂ ارض کی کوئی قوم چین سے نہیں بیٹھ سکتی۔

فاضل صدر نے سب سے پہلے حکومتوں کے عروج و زوال کا فلسفہ بتاتے ہوئے برطانیہ کے موجودہ پوزیشن کو واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ یوروپ کی موجودہ سیاسیات اسکو موجودہ حال پر قایم نہیں رہنے دیسکتے اور تاوقتیکہ وہ سوشلسٹ حیثیت اختیار کرکے اپنے مستعمرات کو آزاد نہ کر دے۔ اس کشاکش میں اس کا باقی رہنا محال ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے وضاحت کے ساتھ یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ برطانیہ کی بحری قوت کی ساکھ اب ختم ہو گئی ہے اور آیندہ جنگ میں جسکا فیصلہ بحر و بر پر نہیں بلکہ ہوا میں ہونا ہے، وہ اپنی قوت کی طرف سے بہت غیر مطمئن ہے —— برطانیہ کی سیاست خارجہ پر (جو قوموں میں باہم گر پھوٹ ڈالنے پر منحصر ہے) صدر نے جو تبصرہ کیا ہے وہ یقیناً بالکل برمحل چیز ہے اور برطانیہ کی اس پالیسی کو پیش نظر رکھ کر ان کا یہ کہنا کہ اگر موجودہ آئین بالکل رد کر دیا جائے

تو بھی وہ کوئی نہ کوئی طریقہ ہندوستان کو بدستور غلام بنائے رکھنے کا اور وضع کرلیگا" قیاس مع الفارق نہیں کہا جا سکتا۔

صدر نے یہ بھی کہا کہ زیر تجویز فیڈرل حکومت میں ریاستوں کے پوزیشن کو، صوبوں کے پوزیشن سے جدا رکھکر دونوں کو ایک ہی رشتہ سے وابستہ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا اور متحدہ ہند کو یہ تجویز سخت نقصان پہونچانے والی ہے۔ اسوقت جبکہ فیڈرل حکومت کا قیام لارڈ لنلتھگو کی انتہائی آرزو ہے اور وہ اسی آرزو کی تکمیل کا طرۂ امتیاز لیکر ولایت واپس جانا چاہتے ہیں، صدر کا فیڈرل حکومت کو رد کردینا اور قبول وزارت کے یہ معنی قرار نہ دینا کہ کانگرس کانسٹی ٹیوشن کی جکڑ بندی سے آزاد ہوکر حصول آزادی کے لئے اور کوئی تدابیر اختیار نہیں کرسکتی ایک ایسے طریق کار کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو سوشلسٹ جماعت کی امیدوں کو بہت بلند کرنے والا ہے۔

اقلیت رکھنے والی قوموں کو مطمئن کرنے کے لئے جو الفاظ صدر نے استعمال کئے ہیں، وہ ہرچند عجیب و جدید نہیں ہیں، لیکن انکے وہ عملی اشارے یقیناً ظاہر ہوتا ہے جس کے بغیر آج تک کوئی اکثریت کامیابی حاصل نہیں کرسکی ہے۔ چونکہ کانگرس کا پروگرام یکسر اقتصادیات و سیاست پر مبنی ہے اس لئے اقلیت کو صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ اس حیثیت سے اس کے حقوق برابر تسلیم کئے گئے ہیں یا نہیں اور اگر نہیں تو کانگرس کا یہ فرض اولین ہوگا کہ وہ مساوات کو قائم رکھے۔ رہا معاملہ مذہب اور کلچر کا، سو اس میں نہ کسی تعرض کی ضرورت ہے اور نہ کانگرس اس میں کوئی تعرض کرنا چاہتی ہے ـــ صدر نے یہ بھی واضح الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ کانگرس اس وقت تک صحیح معنی میں کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک برطانیہ سے اس کا تعلق بالکل جدا نہ ہوجائے خواہ یہ مقصد تدریجی طور پر حاصل کیا جائے یا دفعتاً کسی ایسے ذریعہ سے جو انقلابی ہنگامہ پیدا کرنے والا ہو اور جس حد تک صدر کی ذاتی رائے کا تعلق ہے وہ موخر الذکر طریقہ ہی کی طرف زیادہ مائل معلوم ہوتے ہیں جس کا دوسرا نام "ستیاگرہ" ہے، لیکن ستیاگرہ سے مراد ان کی صرف دفاعی صبر و ضبط نہیں ہے بلکہ وہ عاملانہ و جارحانہ طرز عمل مقصود ہے جس میں کوئی تشدد نہ پایا جائے۔ چنانچہ انھوں نے ارباب کانگرس کو اس طرف متوجہ کیا ہے کہ وہ آیندہ کا پروگرام اسی کو پیش نظر رکھکر بنائیں۔

اختلاف رسم خط کے مسئلہ میں انھوں نے ترکی کی مثال کو سامنے رکھکر مشورہ دیا ہے کہ ہند جدید کو بھی رومن حروف استعمال کرنا چاہئے۔ یقیناً اختلاف دور کرنے کے لئے یہ بہترین تدبیر ہے لیکن انھوں نے یہ غور نہیں کیا کہ قلمرو ترکی میں صرف ایک ہی زبان رائج ہے اور یہاں نہ صرف یہ کہ متعدد زبانوں کا رواج پایا جاتا ہے بلکہ ایک دوسرے سے علحدہ رکھنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔ تاہم اس تدبیر سے ایک طرف اختلاف رسم خط مٹ جائے گا اور دوسری طرف اُردو زبان لیتھوگرافی اور املا کی مصیبت سے آزاد ہو جائے گی۔

مسٹر سوبھاش بوس نے آبادی کے مسئلہ پر بھی لوگوں کو توجہ دلائی ہے جو یقیناً نہایت اہم مسئلہ ہے، انھوں نے کہا کہ ملک کبھی اسکا متحمل نہیں ہوسکتا کہ آیندہ دس سال میں تین کروڑ آبادی کا اضافہ اور ہوجائے۔ اگر آبادی اسی طرح بے تکے پن سے بڑھتی رہی جیسی گزشتہ زمانہ میں بڑھتی رہی ہے تو نہ ہماری اقتصادی مشکلات کسی طرح دور ہوسکتی ہیں نہ سیاسی گتھیاں آسانی سے سلجھ سکتی ہیں۔

ملک کی غربت و افلاس دور کرنے کی تدبیر انھوں نے یہ بتائی ہے کہ ملک سے زمیندار جماعت کے عنصر کو بالکل دور کردیا جائے اور صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے انھوں نے یہ مشورہ دیا ہے کہ اس کو حکومت کی ملکیت میں تبدیل ہونا چاہئے، اسی کے ساتھ خانگی چھوٹی چھوٹی حرفتوں کو عام کرنے کا بھی مشورہ دیا ہے تاکہ زراعت و حرفت دونوں اشتراکی حیثیت اختیار کرلیں۔

جن صوبوں میں کانگرس نے وزارتیں قبول کی ہیں ان کے متعلق صدر کی یہ رائے بالکل حقیقت پر مبنی ہے کہ جب تک دفتری نظام وکیفیت میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو کانگرسی وزارت کوئی فائدہ ملک کو نہیں پہونچا سکتی اور یہ ہونا ممکن نہیں کیونکہ اونچے درجہ کی تمام ملازمتیں جن کا تعلق نظم ونسق سے ہے ان پر صوبہ کی حکومتوں کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے اور براہ راست مرکزی حکومت سے وابستہ ہونیکی وجہ سے نہ ان پر صوبوں کی حکومت کا کوئی دباؤ پڑ سکتا ہے اور نہ انھیں صوبوں کی رعایا سے کوئی ہمدردی ہو سکتی ہے۔

فیڈریشن کی مخالفت کے سلسلہ میں انھوں نے بہت سے حقایق پر روشنی ڈالی ہے اور علاوہ ان دلایل کے جو ورکنگ کمیٹی نے فیڈریشن کی مخالفت میں ۴ فروری ۳۸ء کو واردھا میں بیان کئے تھے، فاضل صدر نے یہ بھی ظاہر کیا کہ ۳۷ء و ۳۸ء کے لئے جو بجٹ مرکزی حکومت کا طیار ہوا ہے اس میں منجملہ ۹۰ء۰۰ کروڑ روپیہ جو مصارف کے لئے تجویز ہوئے ہیں ۴۴ء۶۱ کروڑ روپیہ فوج کے لئے وقف ہے۔ گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ فیڈرل حکومت کے مصارف بہ اندازہ ۸۰ فیصدی مرکزی حکومت کے اختیار میں ہونگے اور اس کا بڑا حصہ فوج پر صرف ہوگا۔ اسی کے ساتھ ریلوے، کرنسی اور اکسچنج کی پالیسی پر بھی لجسلیچر کو کوئی اختیار حاصل نہ ہوگا۔ رہی تجارت سو آئین جدید کی رو سے یہاں کی حکومت کو کوئی حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ ہندوستان کی تجارت کو ترقی دینے کے لئے غیر ممالک اور خصوصیت کے ساتھ برطانوی تجارت پر کوئی امتیازی ٹیکس لگا سکے پس ان حالات میں ظاہر ہے کہ ہندوستان اپنی اقتصادی حالت کیونکر درست کر سکتا ہے ـــــ وفاق میں ریاست کی شرکت کے متعلق اظہار رائے کرتے ہوئے مسٹر بوس کہتے ہیں کہ ریاستوں کی آبادی ہندوستان کی آبادی کا ۲۴ فی صدی ہے لیکن ایوان ادنیٰ میں اُن کو ۳۳ فی صدی اور ایوان اعلیٰ میں ۴۰ فی صدی نشستیں دی گئی ہیں جس کا مقصود سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ متحدہ ہند کی تشکیل میں موانع حائل کئے جائیں اور ملک کو زیادہ سے زیادہ عرصہ تک غلام بنائے رکھا جائے۔ اندریں حالات وفاق کو منظور کرنے کی کوئی صورت ہی پیدا نہیں ہوتی اور آیندہ جب اس کے خلاف ستیاگرہ شروع کیا جائے گا تو اس تحریک کو ریاستوں کی آبادی میں بھی عام کیا جائے گا تاکہ رئیس بلا استمزاج رعایا وفاق کی شرکت کا کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔

جمعیت والنٹیران کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے صدر نے مشورہ دیا ہے کہ اسے بہت زیادہ منظم ہونا چاہئے اور انکی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ کرنا چاہئے، کیونکہ اسوقت کے سیاسی سپاہیوں کو آیندہ ملک و قوم کا لیڈر بننا ہے کانگرس والنٹیروں کے علاوہ اور مختلف سبھاؤں اور انجمنوں کے والنٹیروں کو بھی اسی اصول پر تربیت دینا چاہئے اور ملک کی تمام والنٹیر جماعتوں میں باہم اتحاد و اتفاق ہونا چاہئے، کیونکہ بہرحال سب کی منزل مقصود ایک ہی ہے گو راہیں مختلف ہیں، والنٹیروں کی اس تنظیم کے لئے انھوں نے نازی جماعت کے نظم و اصول کے مطالعہ کی سفارش کی ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی مشورہ دیا ہے کہ اسوقت ملک میں جتنی جماعتیں ایسی پائی جاتی ہیں جن کا مقصود ملک کو برطانوی گرفت سے آزاد کرانا ہو کانگرس کو ان سب کا احترام کرنا چاہئے اور ان سے الحاق کر لینا چاہئے کیونکہ اصل چیز مدعا کا اتحاد ہے، طریق کار میں اختلاف ہو تو ہوا کرے۔

مسٹر سبھاش بوس نے کانگرس کو مشورہ دیا ہے کہ اندرونی مساعی کے ساتھ ساتھ اسکو اپنے بین الاقوامی تعلقات بھی بڑھانا چاہئے، یعنی یوروپ، ایشیا، افریقہ، شمالی، وسطی و جنوبی امریکہ میں اپنے نمایندوں کو بھیجکر اس غلط فہمی کو دور کرنا چاہئے جو ہندوستان کی تہذیب کے متعلق ہر جگہ پیدا کی گئی ہے، اسی کے ساتھ ہم کو اپنی ہمسایہ حکومتوں مثلاً افغانستان، ایران، نیپال، چین، برما اور سیام وغیرہ سے بھی تعلقات وسیع

کرنا چاہئے تاکہ جسوقت ہندوستان آزاد ہو تو وہ بین الاقوامی تعلقات کے لحاظ سے ایک اہم عنصر ہونے کی حیثیت رکھتا ہو۔

آخر میں انھوں نے سیاسی قیدیوں کی آزادی کو حد درجہ اہم ثابت کرتے ہوئے اُن وزراء کے طرزِ عمل کی تعریف کی، جنھوں نے حکومت کی طرف سے اس مطالبہ کو پورا کرتے ہوئے نہ دیکھ کر استعفا دیدیا ہے ---- یہ ہے خلاصہ مسٹر سوبھاش بوس کے اس خطبہ صدارت کا جو کانگرس کے اکیاونویں اجلاس میں انھوں نے ۱۸ فروری ۳۸ء کو بمقام ہری پورہ پڑھا۔ اس خطبہ کی ترتیب، اس کی زبان، اسکا لب لہجہ اور اس کا انداز استدلال سب ایسے دل و دماغ کی چیزیں معلوم ہوتی ہیں جو مغربی سیاست کو سمجھنے کے بعد برطانیہ کی نازک پوزیشن سے فایدہ اُٹھانا چاہتا ہے اور جس کے سامنے ہندوستان کی نجات کا ذریعہ زیادہ تر اشتراکی نظام عمل ہے --- ہر چند یہ پیشین گوئی کرنا تو درست نہیں کہ مسٹر سوبھاش بوس کا مرتب کیا ہوا پروگرام جوں کا توں ہندوستان کے لئے قابل عمل ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن پر عمل کرنا چاہئے اور جو یقیناً ملک و قوم کی ترقی کے لئے مفید ثابت ہونگی۔ اسوقت سب سے زیادہ اہم مسئلہ وفاق کے قبول و عدم قبول کا ہے اور ہر چند کانگرس پہلے ہی سے اسکے قبول نہ کرنے کی طرف مایل ہے لیکن مسٹر سوبھاش بوس نے اس انکار میں اور شدت پیدا کردی ہے اور جس حد تک ریاستوں کا تعلق ہے ان کا نقطۂ نظر زیادہ وسیع ہوگیا ہے۔ اسوقت تک کانگرس ریاستوں کی آبادی سے تبادلۂ خیال کے لئے آمادہ نہ تھی، لیکن نئے صدر کی رائے یہ ہے کہ کانگرس کو اپنی تبلیغ ریاستوں میں بھی شروع کردینا چاہئے تاکہ رؤسا صرف اطمینان لیکر وفاق میں شریک نہ ہوں کہ اُن کو اپنی رعایا سے استمزاج کی ضرورت نہیں ہے --- مہاتما گاندھی جی نے اسوقت تک کوئی تفصیلی رائے اس خطبہ کے متعلق شایع نہیں کی ہے، لیکن ہم نے جہاں تک غور کیا ہے وہ وفاق کے مسئلہ میں کانگرس کے نقطۂ نظر میں ضرور تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کریں گے اور اگر خون کے دباؤ نے انکی موجودہ آمرانہ حیثیت کو نقصان نہ پہونچایا تو آخر میں وہ ضرور شرکت وفاق پر کانگرس کو راضی کرلیں گے۔

یوپی اور بہار کی وزارتوں کا استعفا

اخبارات کے ذریعہ سے قارئین نگار کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ یوپی اور بہار کی وزارتوں نے اس بنا پر استعفا دیدیا ہے کہ گورنر جنرل نے گورنروں کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ سیاسی قیدیوں کی فوری آزادی کے مطالبہ کو پورا کریں --- گورنر جنرل کا جو بیان شایع ہوا ہے اس میں اجازت نہ دینے کا سبب یہ ظاہر کیا ہے کہ جن قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا جاتا ہے وہ تشدد آمیز جرائم کے مرتکب ہوئے تھے اور تاوقتیکہ انفرادی طور پر ہر ہر قیدی کے معاملہ کو نہ سمجھ لیا جاتا (جسکے لئے گورنران طیار تھے) رہائی کا حکم دینا ملک کے امن میں خلل ڈالنے کے امکانات اپنے اندر رکھتا تھا --- اس دلیل کی کمزوری کو نہ صرف ہندوستان بلکہ مغرب کے اہل نظر نے بھی تسلیم کیا ہے، چنانچہ لارڈ لوتھین نے جو حال ہی میں ہندوستانی سیاسیات کا مطالعہ کرکے ولایت واپس گئے ہیں، انھوں نے گورنر جنرل کے اس طرزِ عمل کو پسندیدہ قرار نہیں دیا۔ یوپی اور بہار میں اسوقت پندرہ قیدی ایسے ہیں جن کی آزادی چاہی جا رہی تھی۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم کرلیا جائے کہ وہ رہا ہونے کے بعد ضرور بدامنی پیدا کریں گے (درانحالیکہ وہ امن و سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا وعدہ کرچکے ہیں، اور صوبہ کی وزارتیں بھی اچھی طرح ثابت کرچکی ہیں کہ بصورت نقض امن وہ اپنے اختیارات سے پورا کام لینے کی اہل ہیں) تو کیا انکی دوبارہ گرفتاری ناممکن تھی --- کہا جاتا ہے کہ درپردہ سوال بنگال اور پنجاب کے قیدیوں کا تھا کہ اگر دوسرے صوبوں نے بھی یوپی اور بہار کے تتبع میں ان کی آزادی کا مطالبہ کیا تو کیا ہوگا --- اسوقت تمام ہندوستان میں سیاسی قیدیوں کی تعداد چار، پانسو سے زیادہ نہیں ہے، لیکن کیا یہ امر حیرتناک نہیں کہ وہ مرکزی حکومت جو فوج پر سالانہ ۶۰، ۷۰ کروڑ روپیہ صرف کرتی ہے، چار پانچ سو باغی قیدیوں کی آزادی سے اس قدر خایف ہے کہ صوبوں کی وزارتوں کو استعفا دینے

پر مجبور کرکے ملک کے نظم و نسق کو تو درہم برہم کر دینے پر راضی ہو سکتی ہے لیکن چند قیدیوں کی رہائی گوارا نہیں کر سکتی ــــ اس کی بہترین صورت یہی تھی کہ قیدیوں کو رہا کرتے ہوئے وزارتوں کو متنبہ کر دیا جاتا کہ اگر ان کی طرف سے نقص امن کی صورتیں پیدا ہوئیں اور وزارتوں نے اپنے فرائض قیام امن کو ادا نہ کیا تو گورنر ان براہ راست مداخلت کرکے پھر ان کو گرفتار کر لیں گے۔ اسوقت تک کوئی فیصلہ اس کا نہیں ہوا کہ جن صوبوں میں وزارتوں نے استعفا دیا ہو وہاں اب کس قسم کی حکومت کا تجربہ کیا جائے گا، لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ ممکن ہے وزارتیں پھر واپس آجائیں اور فریقین کے اقتدار کو صدمہ پہونچائے بغیر کوئی مفاہمت ہو جائے[1]۔

سیاسیات یوروپ اور برطانیہ

اس دوران میں دو خاص واقعے ایسے ہوئے ہیں جن سے یوروپ کی موجودہ سیاسیات میں برطانیہ کے پوزیشن پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ پہلا واقعہ تو آسٹریا کی تبدیلِ وزارت کا ہے اور دوسرا مسٹر ایڈن برطانیہ کے سکرٹری خارجہ کے استعفے کا ــــ آسٹریا اپنے جاہ وقوع کے لحاظ سے ایک ایسا ملک ہے کہ نہ اٹلی اسکو گوارا کر سکتا ہے کہ جرمنی اقتدار وہاں قایم ہو اور نہ جرمنی اس حقیقت کو نظر انداز کر سکتا ہے کہ آسٹریا حقیقتاً اسی کا ایک ٹکڑا ہے اور وہاں اسی کا اقتدار قایم ہونا چاہئے، چنانچہ کچھ دنوں قبل جب اٹلی اور جرمنی کے تعلقات اتنے خوشگوار نہ تھے۔ ہٹلر کی زبان سے آسٹریا کا نام سننا بھی مسولینی کو گوارا نہ تھا، لیکن اب وہاں ایک نازی سردار برسر اقتدار ہو جاتا ہے اور اٹلی کان میں تیل ڈالے بیٹھا ہوا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اٹلی اور جرمنی کے درمیان کوئی خاص سمجھوتا ایسا ہو گیا ہے جس کی بنا پر ان دونوں کو اپنے آیندہ جارحانہ اقدام میں ایک دوسرے سے مدد حاصل کرنا ہے ــ ہو سکتا ہے کہ اٹلی مراکش یا مصر کی طرف قدم بڑھانا چاہتا ہو اور جرمنی نے یہ وعدہ کر لیا ہو کہ وہ فرانس و برطانیہ کی سرحدوں پر اُلجھنیں پیدا کرکے ان کو مراکش و مصر کی طرف پوری توجہ کرنے کا موقعہ نہ دیگا اور اسی مفاہمت کی وجہ سے آسٹریا میں نازی اقتدار مسولینی نے گوارا کر لیا ہو۔

یہ امر کسی سے مخفی نہیں کہ اسوقت یوروپ کی سیاسیات کا رخ مسولینی اور ہٹلر کی نگاہوں کے ساتھ ساتھ بدل رہا ہے اور ان دونوں میں سے ہر ایک اپنی مستعمرانہ پالیسی کو وسیع کرنے کے لئے بے چین ہے۔ اٹلی اس لئے کہ حبش پر اس کا قبضہ کبھی مفید نہیں ہو سکتا اگر وہ اس پاس کے کسی زرخیز خطہ پر قابض نہ ہو سکے اور جرمنی اس لئے کہ اس کی اقتصادی مشکلات کا دور ہونا صرف توسیع مستعمرات پر منحصر ہے ــ اسپین میں فاسسٹ و نازی والنٹیروں کا پہونچکر وہاں کے اشتراکی حکومت کو تباہ و برباد کرنے میں مدد پہونچانا صرف روس کی تحریک اشتراکیت کے ڈر سے نہیں ہے بلکہ اس کا مقصود بھی بحر روم میں برطانیہ کے اقتدار کو صدمہ پہونچانا ہے تاکہ اگر مسولینی کسی وقت سرزمین افریقہ میں کوئی اور اقدام کرے تو اس کو برطانیہ کا خوف باقی نہ رہے۔

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ برطانیہ کا اقتدار اس وقت بہت گھٹ گیا ہے اور اس کا بڑا سبب بین الاقوامی مجلس میں برطانیہ کا وہ طرز عمل ہے جو اس نے جاپان اور حبش کے باب میں اختیار کیا۔ اس سے قبل کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ برطانیہ حبش میں اٹلی کی قزاقانہ کارروائیوں کو دیکھتا رہے گا اور حبش کو اپنے وعدۂ امید پر قربان کر دے گا، اسی طرح جاپان نے جو توہین آمیز زیادتیاں کی ہیں ان پر بھی برطانیہ کا بزدلانہ صبر و تحمل کم حیرتناک نہیں۔ لیکن یہ سب واقعات ہیں اور ان سے برطانیہ کی ساکھ کو جو صدمہ پہونچا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آخر کار مسٹر ایڈن سکرٹری وزیر خارجہ صرف اس لئے استعفا دینے پر مجبور ہوتے ہیں کہ وزیر اعظم مسٹر چمبرلین اب اطالیہ کو عرصہ تک ناخوش نہیں رکھ سکتے اور حبش پر اسکی حکومت کے تسلیم کرنے کو اس لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ بغیر اس کے مسولینی کے تعلقات انگلستان سے خوشگوار رہ نہیں سکتے اور مسولینی سے بگاڑ کرکے برطانیہ ایسی وسیع سلطنت کو آتش جنگ سے محفوظ رکھنا ممکن نہیں۔

جرمنی اور اٹلی میں مسٹر ایڈن کے استعفے پر اظہار مسرت کیا جا رہا ہے کیونکہ وہ ان دونوں ملکوں کا مخالف تھا، لیکن فرانس اور امریکہ میں

[1] جس وقت کاپی پریس جا رہی تھی معلوم ہوا کہ مفاہمت ہو گئی ہے اور وزارتوں نے اپنا اپنا کام سنبھال لیا ہے۔

اس کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا، چنانچہ امریکہ نے تو صاف صاف کہدیا کہ اگر حبش پر اٹلی کی حکومت تسلیم کی جاتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ منچوکو اور شمالی چین میں جاپان کی حکومت کو ناجایز تسلیم کیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ برطانیہ کی حالت اس وقت بہت تشویشناک ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اب کیونکر اپنے بھرم کو قایم رکھے۔ بعض کہتے ہیں کہ اب انگلستان میں ویسے سیاست داں دماغ پیدا نہیں ہوتے جیسے اس سے قبل پائے جاتے تھے، لیکن یہ کہنا غالباً زیادہ صحیح ہوگا کہ اب علاوہ انگلستان کے اور ملکوں میں بھی اسی ٹکر کے انسان پیدا ہونے لگے ہیں اور حکومت برطانیہ کے تار و پود میں جہاں جہاں گتھیاں پڑی ہوئی ہیں وہ سب کو معلوم ہو چکی ہیں، جن سے اس کے مخالفین پورا فایدہ اُٹھانا چاہتے ہیں اور اُٹھانا چاہیے کیونکہ اس رسم کی بنیاد سب سے پہلے دنیا میں اسی نے قایم کی ہے اور اب خود بھی اسے برداشت کرنا پڑے گا۔

مکاتیب غالب

خیال تھا کہ اس مہینے میں ان تمام کتابوں پر تبصرہ پیش کروں گا جو گزشتہ چند ماہ کے اندر موصول ہوئی ہیں، لیکن افسوس ہے کہ اب تک اس کا موقعہ نہ مل سکا، تاہم میں ان کتب موصولہ میں سے ایک کتاب کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں جو مکاتیب غالب کے نام سے حال ہی میں مولانا عرشی ناظم کتبخانۂ رامپور نے ایڈٹ کی ہے۔

یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے غالب کے مکتوبات پر مشتمل ہے، لیکن اس میں وہ خطوط نہیں ہیں جو اُردوے معلےٰ اور عود ہندی میں نظر آتے ہیں بلکہ وہ غیر مطبوعہ خطوط ہیں جو انھوں نے فرمانروایان رامپور کے نام تحریر کئے تھے اور جو رامپور کے دارالانشاء میں محفوظ تھے۔

ان مکاتیب کی تعداد ۱۱۵ ہے اور باوجود اس کے کہ صورت عرایض کی سی ہے۔ غالب نے اپنی سنجیدہ ظرافت و شوخ طبعی کو کسی جگہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔۔۔ یہ کتاب علاوہ اس ادبی خصوصیت کے ایک تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہے کیونکہ اس سے متعدد ایسے واقعات کی تصحیح ہو جاتی ہے جو بہ لحاظ واقعہ یا تاریخ وقوع غلط مشہور ہو گئے ہیں۔ مثلاً:- (الف) میرزا صاحب کے سوانح نگاروں نے خود میرزا صاحب کے ایک خط کے استناد پر لکھا ہے کہ میرزا صاحب کا رامپور سے تعلق اُستادی ۱۸۵۵ء میں شروع ہوا۔ حالانکہ یہ ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے۔ (مکاتیب صفحہ ۵۵)
(ب) مولانا مہر نے "غالب" میں لکھا ہے کہ میرزا صاحب کا دربار و خلعت مارچ ۱۸۶۲ء میں بحال ہوا۔ حالانکہ یہ مارچ ۱۸۶۳ء کا واقعہ ہے (ملاحظہ ہو مکاتیب صفحہ ۳۵ و دیباچہ صفحہ ۵۵)۔۔۔ (ج) میرزا صاحب کی ایک تحریر سے یہ قیاس قایم کیا گیا ہے کہ پنشن و دربار وغیرہ کی بحالی میں نواب فردوس مکاں کی سعی کو کچھ دخل نہیں حالانکہ یہ سب کچھ نواب فردوس مکاں کی کوشش سے ہوا۔ (ملاحظہ ہو مکاتیب صفحہ ۲۲ - حاشیہ ۲) - (د) میرزا صاحب کے خاندان میں انکی بیوی اور متبنیٰ پوتوں پر بھی مکاتیب کی اشاعت سے خاص روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ ان کی بیوی کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرزا صاحب کے انتقال کے بعد صرف چند ماہ زندہ رہی۔ انکی دو یا تین تحریریں بھی دیباچہ میں شامل ہیں (ملاحظہ ہو دیباچہ صفحہ ۱۹) پوتوں کی تاریخہائے وفات بھی سب سے پہلی بار اس کتاب میں شایع کی گئی ہیں۔ (ملاحظہ ہو دیباچہ صفحہ ۲۲ و مکاتیب صفحہ ۴۰ حاشیہ ۱) - آغاز میں ایک مفصل دیباچہ ہے جس میں تعلقات رامپور اور میرزا صاحب کی انشا و متعلقات پر خود میرزا صاحب کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔۔۔ حواشی میں کوشش کی گئی ہے کہ میرزا صاحب کے خطوط کا کوئی گوشہ تشنۂ فہم نہ رہے۔ اور جا بجا نواب فردوس مکاں اور نواب خلد آشیاں کے خطوط کے اقتباسات بھی دئے گئے ہیں جن کی وجہ سے کتاب کی خوبی و قدر و قیمت دوبالا ہو گئی ہے۔۔۔ طباعت نہایت اعلےٰ سفید ولایتی کاغذ پر عمدہ و روشن ٹائپ میں کرائی گئی ہے۔ اور جلد نہایت خوشنما ہے۔ آخر میں تین انڈکس بھی دئے گئے ہیں۔ الغرض یہ کتاب ہر حیثیت سے مولانا عرشی کی فاضلانہ سعی و کاوش اور دربار رامپور کی شاہانہ علم دوستی کا بہترین نمونہ ہے۔ قیمت چار روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ مطبع قیمہ بمبئی۔

فلسفہ کیا ہے؟

(مسلسل)

میں ان اعتراضوں کو سلسلہ وار رفع کروں گا کیونکہ بقول جمیس "ان کے رفع کرنے میں بڑی خوبی یہ ہے کہ ہماری رسائی اپنے موضوع کے قلب کی گہرائیوں تک بہ آسانی ہو جاتی ہے"۔

پہلے اعتراض کو لیجئے۔ اس میں تین باتوں پر زور دیا گیا ہے (۱) ایک یہ کہ فلسفہ نے کوئی ترقی نہیں کی وہ آج بھی وہیں ہے جہاں آج سے ڈھائی ہزار سال پہلے تھا۔ (۲) دوسرے یہ کہ اس کے جوابات معین نہیں ہوتے اور (۳) تیسرے یہ کہ اس کا نہ کوئی مقصد ہے اور نہ منہاج۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ اعتراض کچھ ناانصافی اور کچھ غلط فہمی پر مبنی ہے یعنی یہ کہ وہ اتنا وزنی نہیں جتنا کہ بظاہر نظر آتا ہے، وجوہ یہ ہیں:-

(۱) فلسفہ کی ابتداء ۶۰۰ ق-م میں ہوئی۔ اس سنہ سے لیکر آج تک کم و بیش ڈھائی ہزار سال ہوتے ہیں۔ یعنی یہ عمر ہے فلسفہ کی۔ لیکن اس مدت میں سے وہ عرصہ منہا کر دینا ضروری ہے۔ جو ۵۲۹ء سے لیکر (جب کہ شاہ جسٹی نین نے بہ جبر فلسفہ کے مدارس بند کرا دئے) ۱۶۰۰ء تک (جبکہ فلسفۂ جدیدہ کی بنیاد پڑی) بسر ہوا۔ یوں باقی کم و بیش چودہ سو سال رہ جاتے ہیں۔ جو انسانی عقل کی تاریخ کے عرصہ کے مقابلہ میں ایک دقیقہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔

(۲) فلسفہ کے مسایل جیسے کہ یہ ہیں (۱) دنیا کی واحد موجود شئے ذہن ہے یا مادہ؟ (۲) اگر مادہ ہے تو ایک لا یعقل شئے ذی عقل کیسے بن گئی؟ (۳) اگر ذہن ہے تو مادہ کہاں سے آیا؟ (۴) مادہ کے انتہائی ترکیبی اجزار کیا ہیں؟ (۵) دنیا ایک اتفاقی ظہور ہے یا مقصدی؟ (۶) دنیا میں وحدت کارفرما ہے یا کثرت؟ (۷) خیر و شر خوشگوار اور ناگوار اشیاء کے دوسرے نام ہیں یا دنیا میں ان کی حیثیت مستقل ہے؟ (۸) شعور اس دنیا کا کوئی مستقل جزو ہے یا ایک حادثہ ہے جو اتفاق سے کرۂ ارض پر نمودار ہو گیا ہے؟ ایسے مسایل ہیں جن کی تجربی تصدیق ناممکن ہے سائنس نے جو آج اتنی ترقی کی ہے کہ اہل دنیا اس کی ترقی کو دیکھ کر ششدر رہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے مسایل تجربی تصدیق کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ فلسفہ چونکہ اس آگ میں تپنے کی صلاحیت نہیں

رکھتا اس لئے وہ وہیں نظر آتا ہے جہاں کہ وہ آج سے ڈھائی ہزار سال پہلے تھا۔ حالانکہ جن مسایل پر طالیس نے غور کیا تھا ان پر آج تک لاتعداد مسائل کا اضافہ ہو چکا ہے۔ ایک مسئلہ کے ضمن میں صدہا مسایل نئے پیدا ہو چکے ہیں ایک مسئلہ کے متعلق بعض اُمور جو پہلے مشتبہ تھے وہ اب تیقین ہو چکے ہیں اور جو پہلے تیقن تھے وہ مشتبہ۔ یوں فلسفہ جامد نہیں وہ مسلسل ترقی کر رہا ہے لیکن فلسفہ کا چونکہ ایک تو موضوع ہمہ گیر ہے جس کے متعلق یہ تعین کرنا کہ فلاں اس کے موضوع میں داخل ہے اور فلاں نہیں ناممکن ہے اور دوسرے ایک ایسے ہمہ گیر موضوع کے متعلق مختلف اذہان مختلف طور پر فکر کرتے ہیں اختلاف افراد اختلاف طبایع کو مستلزم ہے اور اختلاف طبایع سے اختلاف نظریات لازم آتا ہے لہذا نپے تلے جوابات کی کھوج یہاں بے معنی ہے۔ یوں فلسفہ کا موضوع چونکہ غیر متعین ہے اس لئے بعض کم فہم افراد فلسفی کو ایک ایسے اندھے آدمی سے تشبیہ دیتے ہیں جو ایک اندھیری کوٹھری میں ایک کالی بلی کو ڈھونڈھ رہا ہے اور یہ کالی بلی وہ ہے جو وہاں موجود نہیں۔

یوں معین جوابات کی فلسفہ میں سمائی نہیں۔ جہاں فلسفہ کے کسی شعبہ میں معین جوابات دیے جانے لگتے ہیں تو وہ شعبہ فلسفہ نہیں رہتا سائنس بن جاتا ہے گویا ہر سائنس فلسفہ ہی کی شاخ ہے۔ یعنی جب جوابات وثوق اور تعین کے ساتھ ادا ہونے لگتے ہیں تو فلسفہ سے انھیں تعلق نہیں رہتا۔ بہ الفاظ دیگر یہ کہ فلسفہ ایسے مسئلوں کے مجموعہ کا نام ہے جن کے قطعی جوابات ابھی متعین نہیں ہوئے اس طرح فلسفہ کی مثال آم کے درخت کی ہے جس کی کیریاں درخت سے لگی رہتی ہیں اور شاخیں ٹپک پڑتی ہیں۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو فلسفہ کی نااستواری محض ایک اضافی چیز ہے۔ لیکن اگر وہ اضافی نہ ہو تو بھی بعضوں کے لئے کشش کا باعث ہے فلسفہ کے متعلق ارسطو کہتا ہے کہ وہ حیرت سے پیدا ہوتا ہے اور یہ سچ ہے لیکن وہ نہ صرف حیرت سے پیدا ہوتا ہے بلکہ حیرت بھی پیدا کرتا ہے۔ کوئی ایک معمولی سوال فلسفیوں کے ایک بھرے مجمع میں پوچھ بیٹھئے آپ کو ہر شخص ایک جواب دے گا۔ صحت پر ہیں تو سب ہیں اور غلطی پر ہیں تو سب۔ اس طرح فلسفہ امکانات کے دائرہ کو بہت وسیع کر دیتا ہے۔ ایک معمولی انسان کو معمولی چیزوں پر کوئی حیرت نہیں ہوتی وہ سمجھتا ہے کہ وہ انھیں جانتا ہے لیکن ایک دیانتدار فلسفی کبھی آہنگ ادعا سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کسی معمولی چیز کی ماہیئت سے مدعیانہ اور کماحقہ واقف ہے۔ اگر کوئی ایسا کہے تو سمجھئے کہ اس کی دیانت مشتبہ ہے۔

(۳) فلسفہ مشرق میں جب تک تھا ہم احساسی سحر کے جوامیں تھا یہ میں اوپر بتا آیا ہوں۔ اس کے بعد جب وہ یونان کے ساحل پر اُترا تو اس کے چولہ کو صنمیات کے لباس سے بدل دیا گیا۔ یہ زمانہ اگرچہ انسانی فکر کے بچپن کا تھا مگر اس میں کچھ کچھ شعور پیدا ہو چلا تھا۔ کیونکہ اس نے یہ بھانپ لیا تھا کہ کائنات میں ترتیب

پائی جاتی ہے۔ یونانی صنمیات کی دیوی (Nemsis) کا فریضہ یہ تھا کہ وہ فطرت کی وحشیانہ طاقتوں کو قابو میں رکھے اور باقاعدگی پیدا کرے۔ اس میں شک نہیں کہ (Pan) نامی دیوتا کو بھی یونانی صنمیات میں ایک خاص رتبہ حاصل ہے اور اس کی ہیئت خود بے قاعدگی کی مظہر ہے تاہم یہ چیز غیر فطری نہیں انسان کا قوائے فطرت کے وحشیانہ پن سے مرعوب ہو جانا قرین قیاس ہے مگر اس بے قاعدگی کے دور میں بھی ایک ترتیب کا خیال اہم چیز ہے۔ یوں صنمیاتی فکر نہایت آہستہ آہستہ حکیمانہ اور فلسفیانہ فکر میں منتقل ہوا۔ انسان کے فلسفیانہ اور حکیمانہ افکار پر صنمیاتی دور کا خاصہ اثر ہے۔ طالیس کے ہاں پانی اصل الاشیا ہے لیکن یہ پر تو مصریوں کے (Osiris) دیوتا کا ہے۔ اسی طرح ہرقلیطوس افسوسی کے ہاں آگ مصدر موجودات ہے لیکن پھر بھی مصریوں کے دیوتا Ra کا عکس ہے۔ یہی ہرقلیطوس کہتا ہے کہ سورج کو اس کے مدار پر "ارواح منتقم"، قایم رکھتی ہیں مگر یہ "ارواح منتقم" (Nemsis) دیوی کا مثنیٰ ہیں۔ یوں فکر انسانی نے بتدریج ترقی کی۔

صنمیاتی دور کے بعد مابعد الطبیعیاتی دور آیا اور مابعد الطبیعیاتی دور کے بعد حکمیاتی دور۔ گویا کومت نے مراحل ثلاثہ کا جو قانون مرتب کیا ہے وہ کافی غور و تدبّر کا نتیجہ ہے۔ فکر انسانی نے اب حکمیاتی منزل میں قدم رکھا ہے لیکن فلسفہ کے حکمیاتی ہونے کے معنی یہ نہیں کہ فلسفہ اپنے مسایل کی طرف یکے بعد دیگرے رجوع ہو انھیں سہج سہج حل کرے۔ اولیاتی استدلال سے ہاتھ اُٹھالے، اور مختلف سائنسوں میں تحویل ہو کر رہ جائے جیسا کہ رسل کا خیال ہے کیونکہ ایسی صورت میں یہ ضرورت باقی نہیں رہتی کہ فلسفی کائنات پر مجموعی حیثیت سے نظر کرے اور اس کا ایک مکمل نظریہ ترتیب دے۔ جب یہی ضرورت باقی نہیں رہتی تو خود فلسفہ کب ضروری رہتا ہے۔

(۴) علاوہ ان سب وجوہ کے ایک اور اعتبار سے فلسفہ نے سائنس کے مقابلہ میں بے حد ترقی کی ہے۔ پروفیسر ولیم جیمس پروفیسر جیمس وارڈ کے حوالہ سے کہتا ہے (مسایل فلسفہ باب اول) "بعض لحاظ سے سائنس نے فلسفہ کے مقابلہ میں بہت کم ترقی کی ہے۔ اگر ارسطو اور ڈی کارٹ کو پھر سے دنیا میں آنے کی اجازت کسی نہ کسی طرح مل جائے تو سائنس کے اہم تصورات ان کے لئے نئے اور حیرت انگیز نہیں ہوں گے وہ عناصر کے اشیاء کی ترکیب کے خیال سے، موجودات کے ارتقار کے تصور سے، بقائے توانائی کے اصل الاصول سے، اور ہمہ گیر جبریت کے مسئلہ سے ناآشنا ہوں گے البتہ خوردبینیں، برقی روشنی، ٹیلی فون، ہوائی جہاز، لاسلکی، زہریلی گیس، آہنی قلعے، اور حکمتوں کی ذیلی جزئیات ان کے لئے ہیبت ناک چیزیں ہوں گی۔ اس کے برعکس اگر وہ مابعد الطبیعیات کی جدید کتابوں کا یا ہمارے فلسفیانہ لکچر روم کا معائنہ کریں

تو ہر چیز ان کے لئے عجیب غریب ہوگی۔ ہمارے زمانہ کا تصوری یا انتقادی انداز ان کے لئے بالکل نیا ہوگا۔ اور اس کا احاطہ کرنے کے لئے انھیں ایک زمانہ درکار ہوگا"

اب رہا فلسفہ کے مقصد و منہاج کے تعین کا سوال تو میرا خیال ہے کہ جب فلاسفہ بالعموم علوم مخصوصہ کے نتائج جمع کرتے، ان سے ایک جامع نظریہ ترتیب دیتے، اور یہ بتلاتے ہیں کہ جس دنیا میں ہم رہتے سہتے ہیں اس کی نوعیت اور ہیئت فلاں ہے یعنی جب انھیں سروکار سائنس سے نہیں کائنات کی اس ماہیت سے ہے جو سائنس ضمناً ہمارے روبرو پیش کرتی ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ مقصد اس کے سوا اور کہتے کس کو ہیں۔ رہا منہاج سو ہر فلسفی اپنے تنخصی، ملکی، نسلی، مدنی، مذہبی، اور معاشرتی حالات کے تحت معطیات پیش نظر میں ردوپسند سے کام لیتا ہے اور یہی منہاج ہے۔

اب دوسرے اعتراض کو لیجئے۔ جو اپنی جگہ پر کافی ہے۔

بکسلے نے اپنے اعتراض میں مفصلۂ ذیل چار باتوں پر خاص زور دیا ہے:۔

(۱) یہ کہ علم کا واحد ماخذ حسّی تجربہ ہے۔

(۲) یہ کہ سائنس اسی حسّی تجربہ پر چلتی ہے اسی لئے اس کے نتائج کا اطلاق خارجی دنیا پر ہوتا ہے۔

(۳) یہ کہ عقل آزاد نہیں وہ ایک کٹھ پتلی ہے جو ہماری خواہشوں اور جبلّتوں کے اشاروں پر ناچتی ہے کیونکہ اس کے تار انہی کے ہاتھ میں ہیں۔

(۴) یہ کہ فلسفہ عقل پر مبنی ہے لہذا وہ موضوعی ہے یعنی اس کے نتائج کا اطلاق خارجی دنیا پر نہیں ہو سکتا۔

بنابریں یہاں پر مجھے اسی اعتبار سے پانچ باتیں ثابت کرنی ہیں۔

(۱) یہ کہ علم کے ماخذ دو ہیں (۱) تجربہ اور (۲) عقل۔

(۲) یہ کہ سائنس صرف تجربہ پر نہیں بلکہ عقل پر بھی مبنی ہے

(۳) یہ کہ عقل بالکلیہ خواہشوں اور جبلّتوں کے بس میں نہیں وہ ان کی گرفت سے آزاد بھی ہے یعنی خارجی حق کا حصول ممکن ہے۔

(۴) یہ کہ موضوعی کے معنی وہ نہیں جو بکسلے نے سمجھے ہیں لہذا فلسفہ کے آئینہ میں صرف فلسفی ہی کا نہیں بلکہ خارجی حقایق کا بھی عکس جھلکتا ہے۔

(۵) یہ کہ فلسفہ اگر ٹھیٹھ معنوں میں موضوعی ہے تو سائنس بھی اسی قسمت سے دوچار ہے۔

ان پانچوں امور کو میں اسی ترتیب سے ثابت کروں گا جس ترتیب سے کہ میں نے انھیں پیش کیا ہے۔

(۱) ہمارا علم یکسر تجربی نہیں۔ اس میں ایک عنصر عقلی بھی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس عقلی عنصر کو بالعموم حسّی تجربہ

کے ذریعہ واضح کیا جاتا ہے مگر وہ مبنی حسی تجربہ پر نہیں۔ اس قسم کے علم کی چند مثالیں یہ ہیں (ا) دو اور دو چار ہوتے ہیں (ب) مثلث کے دو ضلعے تیسرے ضلع سے بڑے ہوتے ہیں (ج) کل جزو سے بڑا ہوتا ہے (د) اگر ب مساوی ہے ک کے اور ک مساوی ہو ی کے تو ب مساوی ہے ی کے (ہ) ا ایک وقت ا اور ب دونوں نہیں ہوسکتا (و) ا یا ا ہے یا ا نہیں ہے (ی) ا ا ہے یہ قضیئے ریاضیاتی اور منطقی ہیں۔ اور ان کی صحت کا علم ہم کو حواس کے ذریعہ نہیں ہوتا۔

اس میں شک نہیں کہ ان قضایا کی تفہیم کے لئے حسی تجربہ ضروری ہے کوئی بچہ دو اور دو چار کیسے ہوسکتے ہیں اسوقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ وہ دو کنکریاں اور دو کنکریاں ملا کر چار نہیں بنا لیتا۔ یوں کلی حق کی تحقیق کے لئے جزئی حق کی تکرار از حد ضروری ہے لیکن ایک مرتبہ جب وہ متحقق ہو جاتا ہے تو ہمیشہ کے لئے متحقق ہو جاتا ہے وہ نہ صرف ماضی و حال کے بارے ہی میں صحیح ہوتا ہے بلکہ مستقبل و عدم کے متعلق بھی صحیح ہوتا ہے۔ پس اس حق کا علم حسی تجربہ کے ذریعہ نہیں ہوتا۔ وہ عقل کے ذریعہ ہوتا ہے لہذا عقلی ہے۔

اس طرح ہکسلے کا یہ کہنا کہ تمام علم حسی ہے غلط ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی غلط ہے کہ تمام علم عقلی ہے اس مغالطہ کا شکار بیشتر فلاسفہ ہوئے ہیں۔ پس علم دو طرح کا ہے (۱) حسّی اور (۲) عقلی۔ حسّی علم کی دنیا غیر عقلی، حادث، اور ممکن ہے اور عقلی علم کی دنیا صرف وجوبی ہے۔

(۲) اب ذرا یہ دیکھئے کہ سائنس کہتے کس کو ہیں۔ آلڈوس ہکسلے لکھتا ہے کہ سائنس سے مراد وہ علم ہے جو مظاہر و واقعات کا مشاہدہ کرتا، ان میں ترتیب اور ربط پیدا کرتا اور یوں قوانین مرتب کرتا ہے سائنس کی یہ تعریف تھامس ہنری ہکسلے (جو آلڈوس ہکسلے کا دادا تھا) کی مبینہ تعریف سے چنداں مختلف نہیں۔ ٹی۔ ایچ ہکسلے کہتا ہے کہ:۔ سائنس سے میں وہ علم مراد لیتا ہوں جو شہادت اور استدلال پر مبنی ہو"۔ یوں مشاہدہ و استدلال پر سائنس کی بنیاد ہے لیکن مشاہدہ ہو یا استدلال دونوں کا دارومدار استقراء پر ہے۔ اور استقراء کو کوئی شخص حسی تجربہ کی چیز نہیں کہہ سکتا۔ وجہ یہ کہ استقراء خود حسی تجربہ سے مقدم ہے۔ ہمارے حواس معطیات کے بے ترتیب مجموعہ میں سے کرسیوں اور میزوں کی مربوط دنیا حاصل کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ استقراء مبنی حسی تجربہ پر نہیں مانا کہ وہ استدلال میں بھی پہلے ہی سے مستور ہے تاہم اس سے ثابت صرف اتنا ہوتا ہے کہ اسے نہ تجربہ سے کوئی لگاؤ ہے اور نہ عقل سے تو پھر اس کی صحت کا علم ہم کو ہوتا کیسے ہے؟ یہ بھی ایک سوال ہے مگر اس کا جواب مشکل نہیں۔ کیونکہ استقراء وجدان کی چیز ہے اور وجدان عقل سے منفک نہیں اس کے متعلق میں آئندہ سطور میں اختصار سے کچھ عرض کرونگا

(۳) انسانی فکر کے مورخوں نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ انسانوں نے ہر وقت عقل کو علم کی خاطر استعمال نہیں کیا۔ تاہم وہ اس حقیقت کو نہ چھپا سکے کہ انسانی ذہن نے جیسے جیسے ترقی کی عقل کا بے غرضانہ استعمال

بھی حتی الوسع کیا۔ صنمیات کا مذہب، اوہام کا سائنس نہوسی کا کیمیا، اور نجوم کا فلکیات بن جانا عقل کے اسی بے غرضانہ استعمال کا نتیجہ ہے۔

یہاں پر میں ایک دو مثالیں پیش کروں گا۔

جیسا کہ میں نے ابتدائی سطور میں بتلایا ہے عقل کا بے غرضانہ استعمال یونانیوں کی ایجاد ہے۔ اور صرف یہی ایک گہر دنیا کے علمی طبقوں میں ان کے طرفِ کُلاہ کو سب سے ممتاز کرتا ہے، طالیس ملسطی مصر کا سفر کرتا ہے وہاں دیکھتا ہے کہ مصریوں کے پاس مساحتِ زمین کے بعض طریقے رائج ہیں۔ ہر سال نیل کا دریا اپنی طغیانیوں کو لیکر آتا اور کھیتوں کی مینڈوں کو مٹا ڈالتا ہے۔ جس کی وجہ سے غریب کسانوں کو حد بندیاں پھر سے کرنی پڑتی ہیں ان روز روز کی پریشانیوں سے بچنے کے لئے مصری زمین کو مستطیل رقبوں میں تقسیم کرنے کا ایک طریقہ ایجاد کرتے ہیں۔ طالیس نے غور کرنے پر یہ معلوم کیا کہ اس طریقہ کو اس کے مقصد سے جس کے لئے اسے وضع کیا گیا تھا جدا کیا جا سکتا ہے۔ یوں اس نے اس طریقہ میں تعمیم پیدا کی اور ہر شکل کے رقبوں کی پیمائش کا اسلوب رائج کیا۔ طالیس کو چونکہ کھیتی باڑی سے کوئی لگاؤ نہ تھا اس لئے مساحتِ زمین کے اس نے جو قواعد مرتب کئے وہ علم ہندسہ کی اساس بنے یوں علمی مقصد کا حصول اور انسانی اغراض کی تکمیل کے لئے عقل کا استعمال عقل کے بے غرضانہ استعمال کا ذریعہ بنا۔ یہ عقل کا بے غرضانہ استعمال ہی تھا جس نے یہ دریافت کیا کہ مثلثِ مساوی الساقین کے قاعدہ کے زاویے ہمیشہ مساوی ہوتے ہیں وہ ہمیشہ کیوں مساوی ہوتے ہیں یہ بھی بے غرضانہ تفکر کا ایک کارنامہ ہے۔

اسی طرح یونانیوں نے نجوم کے فن کو فلکیات کے علم میں بدل دیا۔ صدیوں تک بابل کے مذہبی پیشواؤں نے سیاروں کی حرکت کا مطالعہ کیا تاکہ انسانی مقدرات کی پیش بینی کریں جن پر وہ انھیں متصرف مانتے تھے۔ یونانیوں نے ان سے ان کے مشاہدات کے نتائج مستعار لئے اور طالیس نے ۵۸۵ ق - م - ایشیائے کوچک میں واقع ہونے والے گہن کی پیشین گوئی کی۔ یوں یونانیوں نے مشاہدۂ افلاک کے اصلی محرک کو دیس نکالا دیا اور خالص علمی اغراض کے لئے فلکیات کا مطالعہ شروع کیا۔

انہی واقعات کی بناء پر طالیس ملسطی فلسفۂ یونان کا ابوالآباء شمار ہوتا ہے فطری مظاہر کو پہلے فوق الفطری قوی وعوامل سے منسوب کیا جاتا تھا پھر ان قوتوں کو دیوتاؤں اور شیطانوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس کے بعد یہ فرض کیا جانے لگا کہ ان فوق الانسانی طاقتوں کو عبادتوں، قربانیوں، ہونوں وغیرہ سے رام کیا جا سکتا ہے گویا یہ چیزیں ایک طرح کی رشوت تھیں جن کو لیکر دیوی دیوتا انسانوں کے حالِ خراب پر مہربان ہو جاتے تھے۔ گرج اور بجلی بھی ایسی ہی ہستیوں کے افعال تھے لیکن اینکسی مینڈر نے یہ ثابت کرنا چاہا کہ گرج اور بجلی ہوا کے تیز و تند جھونکوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ ہوا کثیف بادلوں میں گھر کر باہر نکلنے کی کوشش کرتی ہے اس کی اس کوشش سے

بادل پھٹتا ہے جس کی وجہ سے گرج سنائی دیتی ہے اور جہاں شگاف ہوتا ہے وہاں چمک پیدا ہوتی ہے۔ جو بادلوں کی تاریکی کی ضد ہوتی ہے اور بجلی کہلاتی ہے۔ یہ اپنی قسم کی پہلی حکیمانہ "توجیہ" ہے۔

یہاں پر آپ نے دیکھا کہ عقل دو طرح استعمال کی گئی ہے۔ اور اس کے ان دو استعمالوں میں ایک اہم فرق ہے پہلا استعمال عقل کا یہ ہے کہ گرج اور بجلی دیوی دیوتاؤں کے اعمال ہیں۔ اور دوسرا یہ کہ وہ ہوا کے بادلوں میں بند ہونے اور نکلنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں عقل کا پہلا استعمال توہم کہلاتا ہے اور دوسرا سائنس توہم میں نامعلوم کو انسانی علامات میں ظاہر کیا جاتا ہے اور سائنس میں بظاہر غیر انسانی علامات میں ظاہر ہوتے ہیں۔

عقل کے مخالفین عقل کی تنقیص کے وقت اس فرق کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ سائنس دنیا کے لئے قوانین نہیں بناتی وہ صرف مظاہر اور واقعات کی فہرست مرتب کرتی ہے سائنس کی کامیابیاں نتیجہ ہیں دنیا پر ایک غیر جانب دارانہ نظر کا۔ یہ غیر جانب دارانہ نظر معروضی واقعات پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔ سائنس واقعات کو اسی رنگ میں لیتی ہے جس رنگ میں کہ وہ اسے نظر آتے ہیں۔ وہ یہ نہیں کہتی کہ اشیاء یوں ہونی چاہئیں، سائنس میں یہ بات صرف اسوقت پیدا ہو سکی جب اس نے اخلاقیات سے کنارہ کشی اختیار کی۔ ابتدائی زمانہ کے علوم مثلاً نجوم اور مہوسی افادات سے مملو تھے ان سے منفعت کے خیالات وابستہ تھے۔ سمجھا یہ جاتا تھا کہ ستاروں کی گردش انسانی مقدرات پر ایک زبردست اثر رکھتی ہے۔ اور یہ کہ بعض عناصر کے ملاپ سے سونا اور چاندی ہاتھ آسکتے ہیں۔ ان وجوہ کی بناء پر سیاروں کی حرکت اور کیمیائی ملاپوں کی ماہیت کا مطالعہ کیا گیا۔ ابتدائی زمانہ کے ماہران طبیعیات یہ سمجھتے تھے کہ دنیا کا ایک مقصد ہے اور یہ کہ وہ اخلاقیات کی رو سے مستحسن ہے یہ خواہش اب بھی ایک حد تک نفسیات میں پائی جاتی ہے نجوم اور مہوسی کے فنون جب افادی خیالات سے منفک ہو گئے تو انھوں نے محیر العقل ترقی کی۔ اور فلکیات اور کیمیا کے لباس میں ظاہر ہوئے۔ طبیعیات بھی صرف اسی وقت ترقی کر سکی جب اس نے یہ ثابت کرنا ترک کر دیا کہ دنیا میں فلاں فلاں اخلاقی خواص پائے جاتے ہیں۔ نفسیات بھی آج کل طبیعیات کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔

توہم سے سائنس کی طرف یہ بڑھاؤ ایک نہایت اہم چیز ہے انسانی خواہشات کی آسودگیوں سے مکمل چھٹکارا عقل کو سب سے پہلے ریاضیات کی قلمرو میں نصیب ہو سکا۔ اعداد کے باہمی علایق کا انسانی جذبات و خواہشات پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اور نہ انسانی جذبات و خواہشات کا اعداد پر کوئی اثر ہوتا ہے۔ اگر میری خواہشات کا اعداد پر یا ان کے باہمی علایق پر کوئی اثر ہوتا تو ۲ × ۲ صرف ۴ نہ ہوتے بلکہ ۵ - ۶ - ۷ - ۸ بھی ہو سکتے۔ لیکن وہ صرف ۴ ہوتے ہیں اور میں بھی یہ خیال کرتا ہوں کہ وہ صرف ۴ ہوتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے ایسا میں کیوں خیال کرتا ہوں اسکی وجہ یہ ہے کہ میں دیکھتا ہوں کہ ہوتا ایسا ہی ہے۔ بہر حال نفس شاعر اور غیر شاعر دونوں کو کھنگال دیکھئے آپ ۲ × ۲ کے ۴ ہونے کی وجہ اس کے سوا اور کوئی پائیں گے ہی نہیں کہ وہ ۴ ہوتے ہیں اس لئے کہ ہوتے ہیں۔ یوں

علم الحساب کو تعلق واقعات سے نہیں ہوتا علایق سے ہوتا ہے اور علایق بھی وہ جو تقادیر کے درمیان پائے جاتے ہیں اشیاء کے درمیان نہیں۔

اس نوبت پر اگر یہ کہا جائے کہ (ا × ب) اور (ا × ب) کا حاصل ضرب۔ اُ۔ بٌ کیا ہے تو مجھے انکار نہیں کہ وہ ایک واقعہ ہے مگر کیسا واقعہ؟ نہ جمیل نہ مقدس نہ مفید نہ معین اور نہ آرام دہ بلکہ صرف واقعہ۔ اس طرح عقل ریاضیات میں بیم و رجا، خوشی و ناخوشی کے خیالات سے بے پروا ہو کر داد تحقیق دیتی ہے۔

ریاضیات کے بعد عقل کا بے غرضانہ استعمال ہم کو اور علوم میں بھی ملتا ہے ارضیات، فعلیات، اور کیمیا کے علوم اس دعویٰ کی دلیل ہیں۔ یہ علوم مادہ اور اس کی ماہیت سے بحث کرتے ہیں لہذا ان میں انسانی اغراض کا کوئی شائبہ نہیں۔ مادہ سے طبیعیات بھی بحث کرتی ہے اور وہ آئن شٹائن، پلینک، رو تھر فورڈ، اور ہائزن برگ کے نظریات سے قبل انہی علوم کے ساتھ تھی یعنی بے غرضانہ تحقیق کا عمل انجام دیتی تھی لیکن طبیعیات جدید کو یہ شرف حاصل نہیں اب مادہ کچھ اس قسم کا بن گیا ہے کہ انسانی خواہشیں ایسے خداؤں میں جو مہندس ہیں اور ایسے ذہنی یا بے ہمہ مسالوں میں جو ہمہ گیر ہیں تبدیل ہو گئی ہیں۔

فلکیات، حیاتیات، نفسیات، سیاسیات، اجتماعی نفسیات، عمرانیات اور دوسرے علوم میں عقل کا بے غرضانہ استعمال اگرچہ ریاضیات کے اتنا پاک، کامیاب، کامل، اور بے عیب نہیں تاہم وہ ان میں پایا ضرور جاتا ہے۔

اور یہ تو ظاہر ہے کہ ریاضیات ہو یا طبیعیات کیمیا ہو یا حیاتیات نفسیات ہو یا سیاسیات، فعلیات ہو یا فلکیات اجتماعی ہو یا عمرانیات سب کی سب فلسفہ کی شاخیں ہیں۔

پس یہاں تک کی بحث سے تین باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

(۱) یہ کہ انسانی عقل معروضی یعنی غیر ذہنی واقعہ کا انکشاف کر سکتی ہے اور یہ کہ غرض، تعصب اور خواہش کا اس انکشاف پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

(۲) یہ کہ عقل ابتداءً خواہشات کو تصدیقات کا درجہ دے سکتی ہے اور اپنی توقعات کا شکار ہو سکتی ہے لیکن سعی و کاوش سے وہ ایسے نتائج کو پا سکتی ہے جن کی تشکیل میں امیدوں کو کوئی دخل نہ ہو یا ہو تو کم سے کم ہو۔ اور

(۳) یہ کہ بعض اوقات ان حالتوں میں جبکہ عقل جبلتوں کی غلام ہوتی ہے اور ان حالتوں میں جبکہ وہ آزادانہ داد تحقیق دیتی ہے تمیز کی جا سکتی ہے۔

(۴) موضوعی کے معنی بالعموم اختیاری کے لئے جاتے ہیں یعنی ہم اپنے دل کے بموجب جو چاہتے ہیں کرتے ہیں اس میں شک نہیں کہ ہمارا اپنے دل کے بموجب کسی کام کو انجام دینا ایک موضوعی فعل ہے مگر جن حالات

میں ہمارا دل ایسا چاہتا ہے وہ کب موضوعی ہیں، انسان کا شعور کائنات کا کوئی بے تعلق مظہر نہیں۔ وہ ایک حیاتیاتی پیداوار ہے جس کو اس کے ماضی نے موجودہ قالب میں ڈھال دیا ہے یوں ہماری خواہشات پر ہمارے ماحول، ہماری نسل، اور ہمارے ورثہ کا بہت اثر ہوتا ہے۔ گویا ان خواہشات کی جڑیں ماضی بعید کی زمین میں گہرے طور پر پھیلی ہوئی ہیں۔ لہذا ان کے آئینہ میں عوامل خارجی کا پرتو منعکس ہے۔ یہ خواہشات انہی عوامل سے متعین ہوتی ہیں۔ اور یہ عوامل موضوعی نہیں۔ یہ خارجی عوامل توارث، تہذیب، نسل، ماحول، غذا، معاشرت وغیرہ ہیں ان سے وہ زمین تیار ہوتی ہے جس پر کسی نسل یا فرقہ کی خواہشات کا بیج پھلتا، پھولتا، اور پروان چڑھتا ہے۔ یہ خارجی عوامل دنیا کے حقیقی اجزا ہیں یوں انسانی خواہشات کائنات کے حقیقی اجزاء کی چغلی کھاتی ہیں۔ اور بنابریں اسقدر موضوعی نہیں جسقدر کہ ہکسلے، رچرڈس، اور لارنس نے انھیں سمجھ رکھا ہے۔

سطور بالا سے یہ نتیجہ بدیہی طور پر اخذ ہوسکتا ہے کہ فلسفہ کے آئینہ میں صرف فلسفی ہی کا نہیں بلکہ خارجی حقایق کا بھی عکس جھلکتا ہے۔ اب یہ دریافت کہ کسی فلسفہ میں فلسفی کا کتنا اور خارجی حقایق کا کتنا حصہ ہے ناظر کا اپنا کام ہے۔ لہذا جنس فلسفہ کی قیمت کا اندازہ کرتے وقت ہم کو اشخاص کا عنصر چھانٹ دینا چاہئے اس کے بعد باقی جو چیز رہے گی وہ ایک ایسی چیز ہوگی جس کا اطلاق دنیائے خارجی پر اچھی طرح ہوسکتا ہے۔

یہاں تک تو ہکسلے کے اعتراض کا اصولی جواب تھا اور اب میں چاہتا ہوں کہ تیسرے اعتراض پر غور کرنے سے پہلے ہکسلے کے اعتراض کا ایک الزامی جواب بھی دیتا جاؤں تاکہ ہر لحاظ سے اعتراض کا رد مکمل ہو۔

(۵) سائنس کے متعلق یہ جو کہا جاتا ہے کہ اس کے نتائج کا اطلاق خارجی دنیا پر ہوسکتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنس صرف یہ کہتی ہے کہ حقیقت یوں ہے اور یوں ہے برخلاف اس کے فلسفہ یہ کہتا ہے کہ وہ یوں اس لئے ہے دوسرے لفظوں میں یہ کہ سائنس واقعات کا مشاہدہ کرتی ہے ان کے گٹھے (جو قوانین کہلاتے ہیں) بناتی ہے اور ان گٹھوں پر یا قوانین کے ذریعہ اور واقعات کی پیش بینی کرتی ہے —— ان واقعات کی پیش بینی کرتی ہے جو ابھی مشاہدہ میں نہیں آئے۔ یہ سچ ہے۔ مگر سائنس صرف اتنے عمل پر قناعت نہیں کرتی۔ وہ اس سے کچھ آگے بڑھ نکلتی ہے۔ وہ اپنے مشاہدات سے ضوابط اور ضوابط سے عالمگیر طور پر قابل انطباق نتائج اخذ کرتی ہے مثلاً حیاتیات داں یہ کہتے ہیں کہ اکتسابی خواص وراثۃً منتقل نہیں ہوتے فعلیات داں یہ کہ روح موت پر جسم سے جدا نہیں ہوتی نفسیات داں یہ کہ ذہنی اعمال کی تعبیر دماغی اور عصبی اعمال سے بخوبی ہوسکتی ہے یعنی دماغ اور اعصاب کے عمل کا دوسرا نام ذہن ہے اور حیاتی کیمیا داں یہ کہ جاندار اور بے جان چیزوں میں کوئی خط ایسا نہیں جسے مابہ الامتیاز قرار دیا جاسکے۔ یہ نتائج صحیح بھی ہوسکتے ہیں اور غلط بھی۔ مگر سوال یہ ہے کہ وہ حاصل کیسے ہوئے کیسے ہوسکے؟ کیا حواس کی شہادت پر سے استدلال کر کے؟ نہیں! تو پھر کیا سائنس داں مشاہدہ شدہ چیزوں

سے ان چیزوں کی ماہیت دریافت نہیں کرتا جن کا ابھی مشاہدہ نہیں ہوا؟ - کیا وہ ان چیزوں کے متعلق تعمیمات نہیں بناتا جن کی کھوج ابھی مکمل نہیں ہوئی؟ - اگر وہ ایسا کرتا ہے اور یقیناً کرتا ہے تو وہ غریب فلسفی کیوں موردلعن وطعن جو اپنے دل کے مطابق حقیقت کو ڈھال لیتا ہے؟ جہاں سائنسداں اپنے قوانین کی بلاواسطہ شہادت سے تجاوز کرتا ہے اور اپنی عقل کو ان یقینیات کی تائید میں دلائل وضع کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے جن کو وہ جبلتہً ماننا چاہتا ہے تو کیا وہ فلسفی سے ذرہ بھر بھی مختلف ہوتا ہے؟ لہذا کس بنا پر یہ کہنا درست ہے کہ فلسفی کے نتائج کا اطلاق خارجی دنیا پر نہیں ہو سکتا اور سائنس داں کے نتائج کا ہو سکتا ہے؟

لیکن دوسرے کو گنہ گار ثابت کرنے سے چونکہ اپنی بے گنہی ثابت نہیں ہوتی لہذا مسئلے کے اعتراض کا صحیح جواب وہی ہے جو اوپر دیا گیا۔

(باقی) مرزا محبوب بیگ

آپ کے فایدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علٰحدہ علٰحدہ خرید فرمائیں گے تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ بریں:-

نگارستان	جمالستان	ترغیبات جنسی	شہاب کی سرگزشت	استفسار و جواب ہر دو جلد
دو روپیہ	چار روپیہ	تین روپیہ	ایک روپیہ	چھ روپیہ
معرکۂ سخن	مکتوبات نیاز	اردو شاعری	ہندی شاعری	میزان کل
ڈھائی روپیہ	ڈھائی روپیہ	دو روپیہ	ڈیڑھ روپیہ	چوبیس روپیہ آٹھ آنے

لیکن

اگر یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف اٹھارہ روپیہ میں مل جائیں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کریں گے۔

منیجر نگار لکھنؤ

ادبیات

(اڈیٹر نگار کی تقریر جو دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی گئی)

(۱)

لٹریچر کا ترجمہ اُردو میں عام طور پر ادب یا ادبیات کیا جاتا ہے جو اپنے اصلی مفہوم کے لحاظ سے بظاہر بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقتاً اس سے بہتر ترجمہ ممکن نہیں۔ ہرچند اول اول عربی زبان میں ادب کا لغوی مفہوم وہی تھا جو انسان کے بلند شریفانہ خصایل کو ظاہر کرتا ہے اور جس کے لئے ایک دوسرا لفظ "تہذیب" بھی موجود ہے لیکن بعد کو استعارتاً اس سے وہ تمام علوم مراد لئے جانے لگے جو ذہنی شایستگی اور تمدنی تعلقات کی پاکیزگی سے متعلق ہیں۔ اور چونکہ لٹریچر کا مقصود اصلی بھی یہی ہے اس لئے غالباً ادبیات سے بہتر اس کا ترجمہ ممکن نہیں۔ اس خاص مفہوم کے لئے لفظ ادب کا استعمال عربوں میں اسوقت سے شروع ہوا جب دوسری اور تیسری صدی ہجری میں وہ عجمی تہذیب اور لٹریچر سے متاثر ہوئے انھوں نے اس موضوع پر مستقل تصانیف بھی کیں جن میں ابن قتیبہ کی ادب الکاتب اور ادب الوزراء خاص شہرت رکھتی ہیں۔ انھوں نے بعض مشاغل تفریح اور لہو لعب کو بھی ادبیات میں شامل کر لیا تھا جو نتیجہ تھا عجمی تہذیب سے متاثر ہونے کا، چنانچہ مشہور وزیر حسن بن سہل نے آداب تہذیب کی دس قسمیں کی ہیں، تین شہرجانی (یعنی عود بجانا، شطرنج کھیلنا، اور نیزہ بازی)، تین نوشیروانی (یعنی علم الادویہ، ریاضیات اور شہسواری)، اور تین عربی (یعنی شاعری علم الانساب اور تاریخ) لیکن دسویں قسم بہت اہم سمجھی جاتی تھی یعنی ان قصوں اور حکایتوں کا علم جو روز کی گفتگو میں بیان کی جاتی ہیں۔ الغرض عرب و عجم میں فنون ادبیہ کی کوئی حد بندی نہیں ہوئی، یہاں تک کہ علوم ریاضیہ کو بھی کبھی کبھی ادبیات میں شامل کر لیا جاتا تھا۔ اخوان الصفا نے علاوہ لسانیات، شاعری اور ریاضی کے نیرنجات، علم الکیمیا اور پیشین گوئی کو بھی ادب میں داخل کر لیا تھا

مغرب میں بھی لٹریچر کی تعریف مختلف الفاظ میں کی گئی ہے اور بعض نے اس کو اسقدر وسیع کر دیا ہے کہ تمام وہ تحریریں جو مختلف اقوام نے مختلف اوقات میں اپنے بعد چھوڑیں ان کے نزدیک ادبیات میں داخل ہیں لیکن

ادبیات کی یہ تعریف صحیح نہیں کیونکہ بہت سی کتابیں ایسی ہیں جنھیں ہم کسی حیثیت سے ادبی نہیں کہہ سکتے اور ادبی وغیر ادبی کتابوں کے درمیان ہمیں خط امتیاز کھینچنا ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم ایک کھانا پکانے کی ترکیبیں بتلانے والی کتاب اور دیوانِ غالب کو ایک ہی درجہ نہیں دے سکتے اور ان کے درمیان کوئی فرق کرنا پڑے گا۔

چارلس لیمپ نے ادبیات کو اسقدر محدود کر دیا ہے کہ اس میں ہیوم و گبن کی تصانیف بھی داخل نہیں ہو سکتیں برخلاف اس کے ہلم (Hallam) نے ادبیات میں، قانون، مذہبیات اور طب سبھی کو شامل کر لیا ہے۔

اگر یہ دونوں رائیں واقعی افراط و تفریط ہیں تو پھر معتدل صورت کیا ہو سکتی ہے، اس سوال کا کوئی قطعی جواب اسوقت تک نہیں دیا گیا ہے۔ ہڈسن لکھتا ہے کہ ادبیات سے مراد صرف وہ کتابیں ہیں جو اپنے موضوع اور طرزِ بیان کے لحاظ سے عام انسانی دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہیں اور جن میں خاص طور پر اس مخصوص طرزِ بیان کا اور پڑھنے والوں کے لطف کا لحاظ رکھا جائے۔ اس اصول سے ایک ادبی کتاب یقیناً نجوم، ہیئت، سیاست، فلسفہ بلکہ تاریخ سے بھی مختلف سمجھی جائے گی کیونکہ وہ کسی خاص طبقہ کے لئے نہیں بلکہ عام طور پر ہر شخص کی دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہے اور اپنے اندازِ بیان سے ہمارے جمالیاتی ذوق کو پورا کرتی ہے، برخلاف اس کے دوسرے فنون کی کتابوں کا مقصد صرف معلومات میں اضافہ کرنا ہے اور دلچسپی پیش نظر نہیں ہے۔

میتھو آرنلڈ نے اس مسئلہ کو بہت زیادہ وسعت نگاہ سے دیکھا ہے وہ کہتا ہے کہ "کتابوں سے جو علم بھی حاصل ہو وہ لٹریچر میں داخل ہے گویا لٹریچر زندگی کی تنقید ہے۔ اگر تنقید سے مراد یہاں تشریح ہے تو اس میں شک نہیں کہ لٹریچر کی یہ تعریف بہت پاکیزہ ہے

اس سلسلہ میں یہ امر بھی غور طلب ہے کہ اچھی کتابوں سے فایدہ حاصل کرنے کے کیا طریقے ہو سکتے ہیں۔ بظاہر ہم کو اس کی تین صورتیں نظر آتی ہیں۔ ذہنی، اخلاقی اور جذباتی۔ یعنی کسی کتاب سے یا تو ہمارے ذہن و عقل پر اثر ہوتا ہے یا اخلاق پر یا صرف ہمارے جذبات میں تحریک پیدا ہوتی ہے اس لئے ایک کتاب کی قیمت یا وقعت کا اندازہ کرنے کے لئے ہمیں ان تینوں باتوں پر غور کرنا چاہئے، ہر چند یہ ضروری نہیں کہ ایک کتاب ان تینوں خصوصیات کے لحاظ سے یکساں طور پر مفید و کارآمد نظر آئے، لیکن اگر کوئی ادبی تصنیف اس معیار پر پوری اُترے اور اسمیں افادہ کی یہ تینوں صورتیں نظر آئیں تو یقیناً ہم اس کو بہترین کتاب کہیں گے۔

کسی کتاب کی عقلی قیمت سے ہمارا منشاء یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی مقصد کی تعیین پر ہمیں آمادہ کرتی ہے اور اس طرح ہماری دماغی یا ذہنی زندگی کو اس سے فایدہ پہونچتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کے پڑھنے کے بعد اگر ہمارا دماغ اس کی تائید کرے تو وہ کسی عقلی قیمت ہی کا نتیجہ ہو۔ مثلاً کسی صابون کے اشتہار کو دیکھ کر ہم خیال کرتے ہیں کہ یہ صابون اچھا ہوگا اور ہم اسے منگا لیتے ہیں۔ پھر اس سے یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہمارے جسم کو کوئی فایدہ

پہونچے لیکن ہمارے ذہن کو اس سے کوئی فایدہ نہ پہونچے گا اگر کسی کتاب کی کوئی عقلی قیمت ہے تو اس سے ہمیں مالی یا جسمانی فایدہ پہونچے یا نہ پہونچے لیکن عقلی فایدہ ضرور پہونچے گا اور یہ ضروری نہیں کہ اس میں ادبیت بھی پائی جائے مثلاً سائنس کی ایک کتاب کہ وہ عقلی قیمت تو ضرور رکھتی ہے اور اس سے یقیناً ہماری زندگی مستفید بھی ہوتی ہے لیکن ہم اسے ادبیات میں داخل نہیں کرسکتے

ادبیات کی اخلاقی قیمت پر بھی لوگوں نے متضاد رائیں قایم کی ہیں۔ بعض کا اصرار یہ ہے کہ اصل چیز ایک کتاب کی اخلاقی قیمت ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ فن کو محض فن کی حیثیت سے دیکھو۔ یونان و روما کے لٹریچر میں اخلاقیات کی اہمیت پر بہت زور دیا جاتا تھا اور اس میں شک نہیں کہ ادبیات عالم کا اکثر حصہ پند و نصیحت پر مشتمل رہا ہے اور نظموں، افسانوں اور ناولوں کے ذریعہ سے ہمیشہ اخلاقیات کا پروپاگنڈا کیا گیا ہے لیکن اصول معاشرت کے ساتھ ساتھ کتابوں کے اخلاقی معیار میں بھی ہمیشہ تغیر ہوتا رہتا ہے اور اسی لئے ادب کی اخلاقی قیمت کو بعض لوگوں نے زیادہ اہمیت نہیں دی ہے۔ چنانچہ مسٹر اسپنگرن (Spingarn) لکھتا ہے کہ نظم نہ اخلاقی ہوتی ہے نہ غیر اخلاقی بلکہ وہ صرف آرٹ کا ایک نمونہ ہوتی ہے اور جس طرح ہم پھول کو بھی سے درس اخلاق کی امید نہیں رکھتے اسی طرح نظم سے بھی اس کی توقع نہ کرنا چاہئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ادبیات سے انسانی زندگی کو جو تعلق حاصل ہے وہ اسکی اخلاقی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کرسکتا اور اس لئے یہ کہنا کہ حُسن و آرٹ کو محض حسن و آرٹ کی حیثیت سے دیکھنا چاہئے اور اس کے اخلاقی یا غیر اخلاقی ہونے کو نظر انداز کردینا چاہئے، کوئی معنی نہیں رکھتا

ہر چند بعض کتابیں مثلاً مذہب و فلسفہ کی ایسی ہوتی ہیں جو صرف اخلاقی یا عقلی قیمت رکھتی ہیں اور ان میں مطلق کوئی ادبیت نہیں پائی جاتی، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ادبیات اور اخلاقیات میں باہم کوئی تضاد پایا جاتا ہو، ہوسکتا ہے کہ ایک کتاب ادبیت بھی رکھتی ہو اور اخلاقیت و عقلیت بھی۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ لٹریچر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جذبات انسانی کو حرکت میں لائے۔ اور اس لئے ادبیات میں اہم ترین چیز اس کی "جذباتی قیمت" ہے۔ جو تصنیف ہمارے جذبات کو اُبھار سکتی ہے وہ یقیناً ادبیات میں داخل ہے خواہ اس کی کوئی اخلاقی قیمت ہو یا نہ ہو۔

اس سلسلہ میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ ادبیات سے انسانی زندگی کا کیا تعلق ہے، اگر یہ صحیح ہے (اور اس کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں)، کہ ایک قابل قدر کتاب براہ راست زندگی سے پیدا ہوتی ہے تو ظاہر ہے کہ اسکے مطالعہ سے زندگی کے ساتھ ہمارے تعلقات بہت گہرے ہوجائیں گے اور اسی کا نام زندہ دلی ہے جو زندگی کی صحیح ترین تعبیر ہے

ادب حقیقتاً ایک ریکارڈ ہے ان تمام تجربات و احساسات کا جن سے ایک انسان اپنی زندگی میں دوچار ہوتا ہے گویا بہ الفاظ دیگر یوں کہہ سکتے ہیں کہ ادب زندگی کا اظہار ہے الفاظ کے ذریعہ سے اور اس لئے جس طرح ادب کی

تخلیق زندگی سے ہوتی ہے، اسی طرح زندگی کی تخلیق بہت کچھ ادب پر منحصر ہے۔

ہر چند اقوام کے مختلف خصائص، افراد کے مختلف مزاج اور ملکوں کے مختلف سیاسی و معاشرتی حالات ادب کی مختلف شکلیں پیدا کرتے رہتے ہیں، لیکن ان میں ادب کی کوئی شکل ایسی نہیں ہے جس میں روح انسانی کا اظہار نہ کیا گیا ہو، جس میں میلانات حیات کی تشریح نہ کی گئی ہو اور تجربات زندگی کے تجزیہ سے جس میں کوئی نہ کوئی نتیجہ خیز بات نہ پیدا کی گئی ہو

ادبیات کے دو پہلو اور بھی قابل غور ہیں ایک عملی (یعنی Functional) اور دوسرا جمالیاتی یعنی (Amusement) افلاطون کی رائے میں ادب کا کام یا (Function) اس چیز کی نمائندگی کرنا ہے جو اس کی آئیڈیل جمہوریت کو لوگوں کے لئے قابل تقلید و عمل بنا دے، چنانچہ اس نے شاعری اور ڈرامہ کی اسی لئے مذمت کی ہے کہ وہ غیر مستحق چیزوں کی نمائندگی کرتے ہیں، لیکن یہ دعویٰ کرنا کہ ادب کا کام صرف اخلاقیات کا درس دینا ہے، درست نہیں

ادب روح کی ایک زبردست آواز ہے جو پیش نظر زندگی کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے ادب کا کام صرف یہی نہیں ہے کہ وہ جدید اشیا کی بابت ہمارے احساس میں تحریک پیدا کرے بلکہ ہماری موجودہ معلومات و اطلاعات کو ترقی دینا بھی اس کا کام ہے۔ یعنی جن اشیاء سے ہم آشنا نہیں ہیں ادب ان سے بھی ہمکو آشنا کرتا ہے اور جن سے ہم فی الحال آگاہ ہیں ان سے ہمارے احساس کو اور زیادہ متعلق کر دیتا ہے

اب ادب کے جمالیاتی پہلو کو لیجئے۔ انسان کی زندگی کا ایک خاص پہلو اور بھی ہے جسے وہ "خوبصورت" کہتا ہے اور اس صفت کو وہ "حسن و جمال" کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ رسمی زبان میں حسن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایسے جذبات پیدا کر دیتا ہے جو ہم اس ظاہری کی پیدا کی ہوئی لذتوں سے جدا ہوتے ہیں اور ہر چند حسن کے اثرات سے ہر شخص کم و بیش واقف ہوتا ہے لیکن ان کی نفسیاتی توجیہ کا علم جسے فلسفہ کی زبان میں جمالیات کہتے ہیں، بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے

جس طرح اور تمام احساسات مختلف کیفیات و مدارج رکھتے ہیں اسی طرح احساس حسن بھی مختلف کیفیتیں رکھتا ہے۔ مثلاً ہم ایک دلکش منظر یا خوبصورت عمارت کو دیکھتے ہیں اور اس سے لطف اٹھاتے ہیں لیکن اس لطف کی نوعیت اس لطف سے بالکل علحدہ ہوتی ہے جو ایک عمدہ فسانہ یا نظم کو پڑھکر حاصل ہوتا ہے۔ ہم اس فرق کو اس طرح ظاہر کر سکتے ہیں کہ اول الذکر لطف میں مادیات کا لگاؤ پایا جاتا ہے اور وہ موخر الذکر میں بالکل نہیں ہے۔ ان کیفیات کے فرق کی دوسری مثال ملاحظہ کیجئے۔ ایک رئیس ہے جو نہایت عالی شان محل میں رہتا ہے اور اپنے قصر کی آرائش و زیبائش سے پورا لطف اٹھاتا ہے، اس محل کو ایک سیاح بھی دیکھتا ہے اور وہ بھی خوش ہوتا ہے

لیکن ان دونوں کی لذت اندوزی میں بہت فرق ہے۔ رئیس کی لذت اس علم سے وابستہ ہے کہ وہ اس کی ملکیت ہے اور سیاح محض اس لئے مسرور ہوتا ہے کہ ایک حسین وجمیل چیز اس کی نگاہ سے گزری اس لئے رئیس کا جذبۂ مسرت یقیناً غیر جمالیاتی اور سیاح کا یکسر جمالیاتی حالانکہ دونوں کے جذبات ایک ہی چیز سے متعلق ہیں

فنون لطیفہ میں نقاشی اور موسیقی سے بھی جمالیاتی لطف اُٹھایا جاتا ہے، لیکن اس کا تعلق حواس ظاہری سے ہے یعنی جب حواس کی بیرونی تحریک ختم ہوجاتی ہے تو لطف بھی زایل ہوجاتا ہے برخلاف اس کے ادبیات کا جمالیاتی لطف کسی بیرونی تحریک سے وابستہ نہیں ہے اور وہ اپنے اثرات بغیر کسی مادی وساطت کے بھی انسان کے ذہن و دماغ پر چھوڑ جاتا ہے

الغرض تمام فنون میں لٹریچر کی وہی حیثیت ہے جو گلدستہ میں چوٹی کے درمیانی پھول کو حاصل ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ صحیح ولطیف انداز بیان میں یوں سمجھنا چاہئے کہ جس طرح ہم کسی پھول کو دیکھے بغیر محض اس کی خوشبو سے اس کی نوعیت کا اندازہ کر لیتے ہیں اسی طرح ہم ایک قوم کے لٹریچر کو دیکھ کر اس کے حیات اجتماعی کے تمام پہلوؤں کو سمجھ سکتے ہیں

لٹریچر سے میری مراد یہاں صرف شاعری یا افسانہ نویسی نہیں ہے بلکہ ایک قوم کا تمام وہ تحریری کارنامہ مراد ہے جو اس نے اپنے بعد چھوڑا اور جس سے ہم اس کی داستانِ عروج وزوال کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اس ریکارڈ میں یقیناً تاریخ درجۂ اول کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اس کا مقصود ہی براہ راست ہماری معلومات میں اضافہ کرنا ہی وہ میتھو آرنلڈ کی تشریح کے موافق "حیات انسانی کی تنقید" بھی ہے اور ٹین (*Taine*) کے بیان کے موافق "سماجی حرکت وعمل کا اظہار" بھی، وہ ایسا جامع ریکارڈ ہے جس سے ایک قوم کے تمام جسمانی و ذہنی قوتوں کے ارتقاء و انحطاط کا حال معلوم ہو سکتا ہے اور اس لئے جس حد تک افادی پہلو کا تعلق ہے تاریخ سے زیادہ مفید و دلچسپ چیز کوئی نہیں۔ اس کے بعد فلسفہ کا درجہ ہے جس سے ہر چند ہمیں ایک قوم کے صرف قوائے ذہنیہ کا حال معلوم ہوتا ہے، لیکن چونکہ ہم اپنی رفتار کا اندازہ ہمیشہ دوسروں کی ذہنی رفتار کو سامنے رکھ کر آسانی سے کر سکتے ہیں اسلئے فلسفہ کا مطالعہ بھی سودمندی کے لحاظ سے کم درجہ کی چیز نہیں۔ اسی کے متوازی میں مذہبی لٹریچر کو بھی سمجھتا ہوں لیکن اس کے مطالعہ کی افادیت خود کسی مذہب سے متعلق ہونے کے بعد بالکل ختم ہوجاتی ہے، کیونکہ کسی لٹریچر کا مطالعہ بغیر اس کے کہ ہم اپنی قوت انتقاد اس پر صرف کریں کوئی معنے نہیں رکھتا اور مذہبیات میں ہم اپنی قوت تمیز سے صرف اسی وقت کام لے سکتے ہیں جب ہم کو خود اس سے کوئی اعتقادی لگاؤ نہ ہو۔ تاریخ کے مطالعہ کے لئے بھی بڑی حد تک اسی بے تعلقی کی ضرورت ہے لیکن نہ اتنی جتنی کہ مذہبیات کے مطالعہ کے لئے ضروری ہے۔ یہ تو ہوا لٹریچر کا وہ حصہ جسے ہم ٹھوس یا وزنی کہتے ہیں، رہ گیا اس کا دوسرا حصہ جسے لایٹ لٹریچر یا ادب لطیف کہتے ہیں وہ نہ

صرف اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ وہ ہمارے جمالیاتی ذوق کو پورا کرنے والا ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ ایک قوم کے تخلیقی ادب (Creative Literature) کا صحیح اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے۔ وہ فنون ہوں یا ادبیات لطافت سے ان کو اسی وقت نسبت دیجا سکتی ہے جب کوئی قوم انتہائی عروج پر پہونچکر محض جذبات کے لئے زندہ رہنا چاہتی ہے۔ ادب لطیف کا ذوق (جس میں شاعری، افسانہ نویسی اور تمثیل نگاری داخل ہیں) ایک قوم کی تاریخ میں اسوقت پختہ ہوتا ہے جب وہ تنازع للبقا Struggle for Existence کی منازل سے گزر کر اپنے جسمانی و ذہنی خستگی دور کرنے کے لئے سکون کی طلبگار ہوتی ہے اور چونکہ حیاتِ قومی کا یہ دور صرف نزاکت خیال سے تعلق رکھتا ہے اس لئے ہم ایک قوم کے ادب لطیف کو دیکھ کر بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں کہ کارزار عالم میں کتنی مصیبتیں جھیلنے کے بعد اس نے کتنی جلاء ذہنی حاصل کی اور اس کے احساس و جذبات کی نزاکت و لطافت اس کی زندگی کے کن کن نشیب و فراز کی ممنون ہے۔ یونتو ایک قوم کے مخصوص نفسیات کا حال ہمیں اسکے لٹریچر کے مختلف شعبوں سے معلوم ہوتا ہے، لیکن عمومی طور پر اس کا علم صرف ادب لطیف ہی کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے اور اسلئے لائٹ لٹریچر کے مطالعہ کے لئے ازبس ضروری ہے کہ ہمیں کسی قوم کی ذہنی و اجتماعی زندگی کا بھی علم حاصل ہو اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ادب لطیف کے سمجھنے کے لئے تنہا جمالیاتی ذوق ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ نہایت وسیع مطالعہ کی ضرورت ہے اور اسی کے ساتھ کھوٹے کھرے کو پرکھنے کی جسے اصطلاح میں تنقید کہتے ہیں اور جس پر میں آئندہ سطور میں اظہار خیال کروں گا

(۲)

ادبیات کے مطالعہ کے سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم چیز جو نہ صرف اپنے ذوق کی تسکین بلکہ دوسروں کے نتائج فکر کی قیمت کا اندازہ کرنے کے لئے بھی ازبس ضروری ہے، اُصولاً اس فن کا جاننا ہے جسے انگریزی میں (Criticism) کہتے ہیں۔ اس کا ماخذ یونانی لفظ ہے جس کے معنے فیصلہ کرنے کے ہیں۔ اُردو میں عام طور پر اس کا ترجمہ تنقید کیا جاتا ہے، لیکن زیادہ صحیح لفظ نقد یا انتقاد ہے جس کا مفہوم پرکھنا یا جانچنا ہے اور وہ شخص جو یہ خدمت انجام دیتا ہے اُسے نقاد کہتے ہیں

اس سے قبل .... میں نے ظاہر کیا تھا کہ ادبیات میں سب سے زیادہ بلند چیز تخلیقی ادب (Creative Literature) ہے اور چونکہ اس سے مراد زندگی کی تشریح ہے اس لئے ایک بلند انتقاد کا صحیح مدعا یہ ہو جائے گا کہ ادبیات کی تمام ان صورتوں پر غور کرے جن کے ذریعہ سے زندگی کی تشریح کی جاتی ہے، اس غور سے جو نتیجہ پیدا ہو وہی ایک نقاد کا فیصلہ کہلائے گا۔ میتھو آرنلڈ کہتا ہے کہ "انتقاد ایک بے لاگ کوشش ہے

اس چیز کے بہترین حصہ کو سیکھنے اور نمایاں کرنے کی جو دنیا کے دائرۂ علم و خیال سے باہر نہ ہو" اس سے مراد اُسکی صرف زندگی کا مطالعہ ہے اور اس مطالعہ کے مختلف طریقوں اور اسلوبوں پر گفتگو کرنا

ادبیات میں تین مختلف قوتیں سرگرم کار پائی جاتی ہیں ایک قوتِ تصنیف، دوسری قوت لذت اندوزی اور تیسری قوتِ انتقاد۔ ان تینوں قوتوں میں سے اول الذکر دو قوتوں کا وجود پہلے پایا جاتا ہے اور اس کے بعد قوت انتقاد اپنا کام کرتی ہے۔ جونہی ایک شخص کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ ایک سے زاید چیزوں میں سے کسی خاص چیز کو ترجیح دینا چاہئے، انتقاد شروع ہو جاتا ہے

اس میں شک نہیں کہ ذوقِ نقد بالکل فطری چیز ہے اور اس کا وجود ابتداء آفرینش سے پایا جاتا ہے لیکن صدیوں کے متواتر انقلاب کے بعد باقاعدہ علم کی صورت اس نے اسی صدی میں اختیار کی ہے۔ عربوں میں یہ فن صرف ابتدائی مدارج تک محدود رہا اور اگر اسماء الرجال و اُصولِ حدیث کو مذہبی لٹریچر سمجھ کر علٰحدہ کر دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے نقد کا موضوع صرف لغت تھا۔ مغربی مصنفین نے اس فن پر بکثرت کتابیں لکھی ہیں لیکن اولیت کا فخر اہل یونان کو حاصل ہے اور اس کے بعد اہل رومہ کو۔ جب فتح قسطنطنیہ کے بعد یونان و رومہ کے اہلِ علم نے اطالیہ میں سکونت اختیار کی تو وہاں کے امرار نے علوم و فنون کی اشاعت میں بہت مدد کی اور انھیں فنوں میں سے ایک فنِ نقد بھی تھا۔ جب زمانۂ مابعد میں علوم و فنون کی کثرت ہوئی اور ایک ہی موضوع پر لوگوں نے مختلف رائیں پیش کرنا شروع کیں تو ضرورت ہوئی کہ ان مختلف خیالات اور مذاہب (Schools) کے سمجھنے کے لئے کوئی صحیح معیار قایم کیا جائے چنانچہ یوروپ کی تمام قوموں نے اس طرف توجہ کی، خصوصیت کے ساتھ فرانس جہاں قدرت کی طرف سے لوگوں کو غور و فکر اور ذہن رسا کے ساتھ ساتھ ظرافت کا بھی کافی حصہ ملا ہے جو فن نقد کے لئے بہت ضروری ہے

اس فن نے ادبیات کو کس حد تک متاثر کیا، اس کی تفصیل کا موقعہ نہیں لیکن مختصراً یہ بتانا ضروری ہے کہ عہد حاضر میں اس فن کے شرائط کیا ہیں اور ایک نقاد بننے کے لئے کن اُصول کی پابندی لازم ہے۔ اگلے زمانہ میں نقد کا مدار صرف وہ اُصول و قواعد تھے جو متقدمین کے علوم و فنون سے اخذ کئے گئے تھے، مثلاً اگر کوئی شخص علم لغت پر کوئی کتاب لکھتا تو وہ اسی وقت صحیح مانی جاتی جب ائمۂ لغت کے کلام سے مستنبط ہوتی یا ان کے مقررہ اُصول پر مرتب کی جاتی کیونکہ قدمار کے اُصول لازوال حقیقت تسلیم کئے جاتے تھے۔ لیکن اٹھارویں صدی سے علوم و فنون کا نیا دور شروع ہوتا ہے کیونکہ اس زمانہ میں فنون کی ترقی کا مدار صرف بحث و تجربہ قرار پایا۔ وہ عہد جب ارسطو کے اقوال ایک ناقابل انکار حقیقت تسلیم کئے جاتے تھے گزر گیا اور دنیا جدید تمدن کے ساتھ ساتھ کورانہ تقلید اور قدمار کے تسلط سے آزاد ہو کر بجائے اقوال ماثورہ کے صرف تجربات، مشاہدات اور بحث و نقد کو معیار صداقت سمجھنے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام علوم و فنون میں نمایاں ترقی ہونے لگی اور ایک ایک مسئلہ پر بڑی بڑی اہم کتابیں تصنیف ہونے لگیں۔ انھیں میں ایک فن نقد بھی ہے جس نے ایک مستقل علم

کی صورت اختیار کرلی ہے۔

اس فن کی غرض صرف یہ ہے کہ تصانیف اور اُن کے موضوع سے بحث کی جائے اور مصنف و زمانۂ تصنیف کی باہمی مناسبت ظاہر کرکے ان کتابوں سے مقابلہ کیا جائے جو کسی مخصوص موضوع پر مختلف زمانوں اور ملکوں میں لکھی گئی ہیں۔ علمی رایوں پر اعتراض کرنا نقاد کا کام نہیں ہے کیونکہ نقاد کے لئے ہر موضوع میں مہارت تامہ رکھنا ضروری نہیں ہے البتہ ہر عہد اور ہر ملک کی علمی تاریخ سے اس کا آگاہ ہونا یقیناً لازم ہے کیونکہ فن نقد اور تاریخ علم و ادب میں باہم بہت ربط پایا جاتا ہے

فن نقد کے تین اغراض ہیں:۔ تشریح۔ حکم اور تعیین مراتب۔ جو شخص کسی کتاب پر نقد کرے اسے چاہئے کہ پہلے اسے غور سے پڑھکر سمجھ لے اور اسی کے ساتھ اس موضوع کی اور کتابوں کا بھی مطالعہ کرے کیونکہ بغیر اسکے وہ کتاب زیر نقد کا کوئی درجہ متعین نہیں کر سکتا

متقدمین کا قاعدہ تھا کہ جب وہ کسی کتاب پر نقد کرتے تھے تو صرف اس کے موضوع اور مضامین پر نگاہ ڈال لیتے تھے اور معانی و لغت صرف و نحو کی حیثیت سے اسپر نظر کرتے تھے، لیکن موجودہ فن نقد بہت بلند ہے، آج جب کوئی شخص نقد کرتا ہے تو اسے یہ بھی بتانا پڑتا ہے کہ علم و ادب کی تاریخ میں یہ کتاب کس درجہ میں رکھی جانے کی مستحق ہے، اسکے مضامین کو موضوع سے کہاں تک مناسبت ہے، عصرِ حاضر سے اس کا کیا تعلق ہے اور تصنیف کو مصنف اور اس کے ماحول سے کیا نسبت حاصل ہے

سب سے پہلے وہ مصنف کے سوانح حیات پر نگاہ ڈالتا ہے کہ اس کے وطن کا جغرافی موقع اور ماحول کی کیا حالت ہے، وہ کس خاندان یا قوم سے تعلق رکھتا ہے، کن لوگوں میں اس نے تربیت پائی، اس کا خاندان غریب تھا یا دولتمند، اس کا لڑکپن اور شباب کن افکار و مشاغل میں بسر ہوا، زمانہ اس کے موافق تھا یا مخالف، اس نے تحصیل علوم کہاں کی، کن لوگوں سے استفادہ کیا، اس کی زندگی کس طرح بسر ہوئی، کسی سے اس کو محبت ہوئی یا نہیں، زندگی اسے عزیز تھی یا نہیں، وطن سے باہر اس نے سیاحت کی یا نہیں، زندگی میں اسے کیا کیا تجربات حاصل ہوے، لوگوں کے ساتھ اس کا سلوک کیسا رہا، اس کی دماغی حالت و جسمانی صحت کیسی تھی۔ الغرض نقاد ان تمام باتوں سے باخبر ہوکر کتاب کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرتا ہے اور اسی کا نام تشریح ہے

اس کے بعد حکم کا درجہ ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ نقاد اپنے ذاتی میلان اور انفرادی ذوق سے علٰحدہ ہوکر کتاب کے موضوع کے لحاظ سے منصفانہ رائے قایم کرے یعنی اگر اس کی طبیعت ڈراما کو پسند کرتی ہے تو خواہ مخواہ ناول کی بُرائی نہ کرے، اگر اُسے ابونواس کے خمریات سے دلچسپی ہے تو عنترہ کی رزمیات پر اعتراض نہ کرے، اگر اسے میرانیس کے مراثی اچھے معلوم ہوتے ہیں تو وہ غالب کے تغزل پر معترض نہ ہو بلکہ ہر تصنیف کو منصفانہ نگاہ سے دیکھے اور اسکے

محاسن و معائب پر انصاف سے قلم اُٹھائے اور سوائے اظہار حقیقت کے کوئی اور غرض اسکے پیش نظر نہ ہو۔ اسی لئے بہترین نقاد وہی ہو سکتا ہے جو کسی خاص فن یا موضوع سے گہری دلچسپی نہ رکھتا ہو بلکہ عام علمی مذاق رکھتا ہو

حکم کے بعد تعیین مراتب کی منزل آتی ہے۔ مثلاً اگر ہم آتش، مومن و غالب کے حالات زندگی شخصی خصوصیات اور مخصوص اسالیب بیان معلوم کر کے ذوق سلیم سے کام لیں تو ان میں سے ہر ایک کا درجہ متعین کرنا پڑے گا۔ یہی وہ چیز ہے جو فرائض نقاد میں سب سے زیادہ نزاکت و اہمیت رکھتی ہے۔ اور اسی لئے اُصول نقد مرتب کرنے کی کوشش عرصہ سے جاری ہے مگر کسی مخصوص قسم کے ادب کو سامنے رکھ کر ان اُصول کے مکمل ہونے کی ذمہ داری نہیں لیجا سکتی اس کا سبب صرف یہ ہے کہ یہ اُصول خوبیوں کا مقابلہ کر کے مرتب کئے جاتے ہیں۔ اگر نظریۂ ادب پہلے عقلی اُصول کے مطابق مقرر کر لیا جائے تو نقد میں بھی آسانی ہو سکتی ہے اور اس کا بھی کوئی اُصول مستنبط ہو سکتا ہے، لیکن یہ شاید اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ادبیات کا وجدانی پہلو محو ہو کر اس کی بنیاد یکسر افادیت پر قائم نہ ہو اور یہ نہ صرف دشوار ہے بلکہ ادبیات کی لذت اندوزی کو محو کر دینے والا بھی ہے

اس فن کے تاریخی پہلو پر جس وقت غور کیا جاتا ہے تو ہمیں اس کے دو شعبے نظر آتے ہیں ایک نظری (Theoretic) اور دوسرا عملی (Practical)۔ سترھویں صدی تک انفرادی طور پر کتابوں اور مضمونوں کے انتقادی تجربے ہم کو نہیں ملتے البتہ انتقادی نظریوں پر منتشر خیالات جا بجا نظر آتے ہیں۔ مگر ارسطو، ہوریس اور بوطیلو وغیرہ نے شاعری پر جو اُصول نقد مرتب کئے تھے اور جن کو (Poetics) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بیشک زمانۂ قدیم کی اہم چیزیں ہیں۔ ان مصنفین نے دو کوششیں کی ہیں ایک یہ کہ انھوں نے ادب یا شاعری کی تعریف متعین کی اور دوسرے یہ کہ نظموں کی قسمیں کر کے رزمیہ، حزنیہ اور انبساطیہ منظومات کے قواعد و اُصول علحدہ علحدہ مرتب کئے یہ قواعد بظاہر اُصولی (Dogmatic) معلوم ہوتے ہیں لیکن فی الحقیقت نتیجہ ہے صرف استقرا (Induction) کا

سب سے پہلے ارسطو نے یونان کے بڑے انشا پردازوں کے طرز تحریر کو دیکھ کر اُصول انتقاد مرتب کئے۔ مثلاً یہ دیکھ کر کہ ہومر کی نظموں میں پہلے تمہید ہوتی ہے، اس کے بعد اصل بیان اور پھر نتیجہ، ارسطو نے طے کر دیا کہ ہر رزمیہ نظم کو انھیں تین حصوں میں منقسم ہونا چاہئے۔ ارسطو کے بعد ہوریس وغیرہ نے کچھ اور اُصول مرتب کئے اور سولھویں صدی تک ان کی پابندی بھی کی گئی، لیکن آخر کار یہ بھی بدلے اور نئے اُصول بنائے گئے۔ چنانچہ سولھویں صدی کے ایک نقاد ارٹینو (Aretino) کا خیال ہے کہ "شخصی و انفرادی ذوق کے علاوہ نقد و انتقاد کا کوئی معیار نہیں ہے" اناطول فرانس ایک اچھے نقاد کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے کہ: "بہترین نقاد وہ ہے جو ادبیات کے شاہکاروں کے سلسلۂ ذکر میں خود اپنی روح کے کارنامے بیان کرتا ہے، بعض ایسے نقاد بھی ہیں جو

اپنی تصانیف کو سائنس کا درجہ دیتے ہیں

ایک اسکول انتقاد کا اور ہے جو اسے بالکل وجدان یا جمالیات (Aesthetics) سے متعلق سمجھتا ہے چنانچہ مسز پفر ہو (Mrs. Puffer Howe) کا خیال ہے کہ "انتقاد کا اصل مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ ایک تصنیف میں کیوں دلکشی پائی جاتی ہے اور وہ کیونکر پیدا ہوئی"، گویا اس کے نزدیک انتقاد کا دایرہ صرف جمالیاتی دایرہ ہے اور اسی کے اندر رہکر جذباتی تشریح و تجزیہ کرنا چاہئے

مولٹن (Moulton) نے عہد حاضر کے فن انتقاد پر لکھتے ہوئے اس کی تین قسموں کا ذکر کیا ہے ایک استقرائی یعنی (Inductive) جس کے ذریعہ سے ہم کسی کتاب کے موضوع کی تشریح کرکے اسکا تصنیفی درجہ متعین کرتے ہیں۔ دوسری قسم تفکری یعنی (Speculative) ہے اس سے مراد ادب کے فلسفیانہ پہلو پر غور کرنا ہے اور اسی لحاظ سے مخصوص نظریوں کو قایم کرکے کسی نتیجہ پر پہونچنا۔ تیسری قسم تشریعی یا (Judicial) ہے جو کسی ادبی تصنیف کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے اس کو صرف مفروضہ اصول انتقاد پر منطبق کرکے فیصلہ کرتی ہے۔

ہرچند یہ بالکل درست ہے کہ ہم کو کسی تصنیف پر نقد کرنے کے لئے پورا مواد جمع کرکے اس کا تجزیہ اور اسکی دلکشی ولذت اندوزی کی صراحت کرنا چاہئے لیکن ساتھ ہی ساتھ ہم کو یہ بھی دیکھ لینا چاہئے کہ وہ تصنیف واقعی کوئی ایسی چیز ہے جس سے انسانی روح لذت حاصل کرسکتی ہے اور اس اکتساب لذت کے اسباب کیا ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم خود اپنے لئے چند اصول مرتب کرلیں کیونکہ آجکل جبکہ فن انتقاد کے متعدد اسکول پائے جاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک نے اپنے لئے علٰحدہ قواعد مقرر کرلئے ہیں، ایک آزاد نقاد کے لئے بہترین طریقہ یہی ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو کسی اسکول کا پیرو نہ سمجھے اور خود اپنی قوت تمیز سے کام لیکر حسن و قبح کا فیصلہ کرے

یہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ نقاد کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی خاص فن یا موضوع سے گہری دلچسپی رکھتا ہو بلکہ اسکو ایک عام علمی و ادبی ذوق رکھنے والا انسان ہونا چاہئے، لیکن اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ ہم اس علمی و ادبی ذوق کو اتنی وسعت دیدیں کہ ہر وہ شخص جو ایک عمومی آگاہی مختلف علوم و فنون کی رکھتا ہے وہ ہر علم و فن کی کتاب پر نقد کرنے کا اہل قرار پائے، یا یہ کہ جو کسی ایک ہی مخصوص فن سے گہری دلچسپی رکھتا ہے وہ اس فن کی کتابوں پر نقد کرنے کا مستحق قرار نہ پائے۔ ایسے لوگ جو تمام علوم سے دلچسپی رکھتے ہوئے ان کی ضروری آگاہی بھی رکھتے ہوں بہت کم ہوتے ہیں، اس لئے قابل عمل صورت صرف یہی ہے کہ ہر شخص کے ذوق و اکتساب کے لحاظ سے انتقادی خدمت کی توقع اس سے کرنا چاہئے

ہوسکتا ہے کہ ایک شخص فلسفہ کا خاص ذوق رکھتا ہو اور ساتھ ہی ساتھ ادبیات حسن و قبح کے سمجھنے کی بھی اہلیت رکھتا ہے پس ایسی صورت میں وہ یقیناً فلسفہ کی کتابوں پر نقد کرنے کا زیادہ مستحق سمجھا جائے گا لیکن ادبیات پر گفتگو

کرنے سے بھی اسے باز نہیں رکھا جا سکتا۔ لیکن یہ یقیناً ظلم ہوگا کہ ایسا شخص جو شاعری سے بالکل لگاؤ نہیں رکھتا اس کو مومن و غالب کے موازنہ کا اہل سمجھا جائے، محض اس لئے کہ فلسفیات میں اس کی نکتہ آفرینیاں بہت مشہور ہیں۔

ادبیات یا شاعری میں دو لفظ اکثر سننے میں آتے ہیں ایک، سخن گو اور دوسرا سخن فہم، میری رائے میں یہ دونوں لفظ اصطلاحات انتقادیات میں شامل کر لینے کے قابل ہیں کیونکہ نظری و عملی انتقاد کے سلسلہ بحث میں ان سے بہت مدد مل سکتی ہے۔ اگر ایک شخص اچھا شاعر ہے تو ہم اسے سخن گو کہتے ہیں، لیکن دوسرا جو شاعر نہیں ہے، مگر ذوق شعری پاکیزہ رکھتا ہے اسے سخن فہم کہتے ہیں۔ پھر جس طرح ہر سخن فہم کا سخن گو ہونا ضروری نہیں اسی طرح ہر سخن گو کا سخن فہم ہونا بھی لازم نہیں۔ اور اس کی نمایاں ترین مثال میں ہم میر کو پیش کر سکتے ہیں کہ یوں تو وہ سخن گوئی کے لحاظ سے یقیناً خدائے تغزل ہے، لیکن جسوقت وہ خود اپنے اشعار کا انتخاب پیش کرتا ہے، تو ہم کو حیرت ہوتی ہے کہ دنیا جن اشعار کو میر کے نشتر سمجھتی ہے وہ خود میر کے نزدیک، دل میں پھانس چبھونے کی بھی اہلیت نہیں رکھتے۔ میں نے قوتِ انتخاب کا یہ نقص اکثر اچھے شعراء میں پایا ہے اور نفسیاتی حیثیت سے غور کرنے کے بعد میں اس کو بالکل قرینِ عقل پاتا ہوں کیونکہ شاعر کی حیثیت ایک ایسے آرٹسٹ کی ہے جو اپنی ہر کوشش میں اپنی ساری روح صرف کر دیتا ہے اور اپنے تمام ادب پاروں کو وہ اسی نگاہ سے دیکھتا ہے جیسے باپ اپنی متعدد اولاد کو دیکھتا ہے اس لئے جب اس کو خود اپنے کلام کے انتخاب پر مجبور کیا جائے گا تو یقیناً وہ کوئی صحیح رائے نہ دے سکے گا۔ اسی لئے انتقاد کا حق ادا کرنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ گریباں میرا ہو تو ہاتھ آپ کا میں خود اپنے ہاتھ سے اپنے گریبان کی وسعت و تنگی کی داد نہیں دے سکتا۔

ادبیات اور خصوصیت کے ساتھ شاعری پر تبصرہ کرنے کے سلسلہ میں سب سے زیادہ جھگڑے کی چیز ذوق کا سوال ہے، ہو سکتا ہے کہ ایک ہی چیز آپ کے لئے پسندیدہ ہو اور میرے لئے ناگوار۔ ایک ہی انداز بیان مجھے بھاتا ہو اور آپ کو پسند نہ ہو اور اسی لئے انتقادیات میں یہ مسلّمہ اصول مان لیا گیا ہے کہ جسوقت سوال صرف ذوق کا پیدا ہوگا تو ہمیں طبقۂ خواص کو سامنے رکھنا پڑے گا اور انھیں کے بتائے ہوئے اصول پر عمل کر کے فیصلہ کرنا پڑے گا۔ اور یہ اصول تقریباً وہی ہیں جن کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں اور جن کی بنیاد وجدان و نفسیات دونوں پر قایم ہے۔

ضرورت ہے

نگار جنوری و اپریل تا دسمبر ۳۴ء - جون ۳۵ء - مئی، جولائی و اگست ۳۶ء - فروری و ستمبر ۳۷ء کے پرچوں کی اگر کوئی صاحب علٰحدہ کرنا چاہیں تو دفتر میں اطلاع دیں۔

مینجر نگار

سیاسیات یوروپ

(۲)

(ہٹلر کی داستانِ عروج)

پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ ہٹلر اپنی جائے پیدائش کے لحاظ سے آسٹریا کی رعایا تھا اور جرمنی میں کسی عہدہ کا امیدوار بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک شخص جرمن حقوق رکھتا ہو۔ یا یہ کہ وہ معزز سرکاری عہدار ہو۔ جرمن پارلیمنٹ ہٹلر کو جرمن حقوق دینے کے لئے طیار نہ تھی اس لئے دوسری صورت یہی تھی کہ اسے سرکاری افسر بنا دیا جائے، چنانچہ نازی وزیر، ڈاکٹر فرک نے ہٹلر کو فوج میں ایک دستہ کا افسر بنا دیا لیکن جب اس ترکیب کا مضحکہ اُڑایا گیا تو اسے اس عہدہ سے ہٹنا پڑا۔ دوسری مرتبہ ایک اور نازی وزیر نے ہٹلر کو ایک ایسی غیر معروف جگہ پر مقرر کر دیا جس کے وجود کا خود اکثر جرمنوں کو بھی علم نہ تھا اور اس طرح آخر کار ہٹلر "جرمن" بن گیا

ہٹلر کا سیاسیات میں داخلہ ہٹلر سیاسی زندگی میں ایک جاسوس کی حیثیت سے داخل ہوا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں خفیہ پولیس کے ایک افسر کی حیثیت سے اُسے مقرر کیا گیا اور کام یہ تھا کہ مزدوروں کے جلسوں میں شریک ہو کر وہاں کی کارروائیوں کی اپنے افسروں کو اطلاع دیتا رہے۔ ایک مرتبہ ہٹلر کو ان جلسوں میں گاٹفریڈ فڈر کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا جس کا اُس پر بہت اثر ہوا۔ دوسری مرتبہ جب وہ اس کی تقریر سننے آیا تو خود بھی جلسہ کی کارروائی میں حصہ لینے لگا اور جون ۱۹۱۹ء میں اس پارٹی کا ایک سربرآوردہ رکن بن گیا۔ رفتہ رفتہ ہٹلر کو اس پارٹی میں اقتدار حاصل ہوتا گیا اور اُسی کی وجہ سے اس جماعت نے قوت حاصل کی۔ اسی نے اس جماعت کا نام بلاجواب مخفف ہو کر نازی، کہلاتا ہے۔ ہٹلر نے ایک پرائیویٹ فوج طیار کی جس کا نام اس نے (یعنی خاکی پوش) رکھا اور ۱۹۲۳ء میں اُس نے میونخ میں انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی مگر حکومت نے اُسے بغاوت کے جرم میں گرفتار کر لیا اور سزا دیدی۔ جیل سے نکلنے کے بعد ہٹلر کی طاقت اور زیادہ ہوگئی

شروع شروع میں نازی جماعت کا جو پروگرام، فڈر نے تیار کیا تھا اور جس کے متعلق ہٹلر کہتا تھا کہ یہ پروگرام

ناقابل ترمیم ہے، بہت کچھ اشتراکیت پسند تھا لیکن اقتدار حاصل کرنے کے بعد ہٹلر نے خود ہی اس پروگرام سے ہٹنا شروع کیا اور اس میں جو اجتماعی عنصر پایا جاتا تھا وہ کم ہونے لگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہٹلر نے یہ پروگرام محض عوام کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے تیار کیا تھا ورنہ اُسے یہ پالیسی شروع ہی سے پسند نہ تھی۔ بہر حال گو ہٹلر نے نازی جماعت کو فڈر اور ڈرکسلر کی وساطت سے پایا تھا مگر اس کی اصلاح و تنظیم کا ذمہ دار تنہا وہی تھا۔ اور جب سرمایہ داروں نے یہ دیکھا کہ یہ جماعت قوی ہوتی جا رہی ہے اور اس کا اشتراکی عنصر ختم ہوتا جا رہا ہے تو انھوں نے بھی اُسے کافی مالی امداد دینا شروع کر دی

ہٹلر کا عروج ہٹلر کے عروج کا ایک سبب یہ ضرور تھا کہ اس نے لوگوں کے دلوں میں یہ بٹھا دیا کہ جرمنی کا اصل نمائندہ وہی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ حسب ذیل اسباب اور بھی تھے :۔

(۱) فرانس کے حملہ روہر (Ruhr) کے بعد جرمنی کے ادنیٰ طبقۂ اوسط (Lower middle class) کی حالت بہت سقیم ہو گئی تھی اور ہٹلر کا پروگرام ان کے لئے بہت امید افزا تھا اس لئے انھوں نے ہٹلر کے مواعید پر بھروسہ کر کے اُسے اپنا پیشوا اور رہبر تسلیم کر لیا۔

(۲) سابق چانسلر برونگ کی سخت گیر پالیسی سے اعلیٰ طبقۂ اوسط (Higher middle class) بھی برہم تھا اس لئے وہ بھی ہٹلر کا طرفدار بن گیا

(۳) بڑے بڑے کارخانہ داروں اور سرمایہ داروں نے ہٹلر کو مالی امداد دینا شروع کر دی اس خیال سے کہ ہٹلر ان کے ہاتھ میں ہمیشہ کٹھ پتلی بنا رہے گا۔

(۴) خود جمہوریت جرمنی کے افسروں نے سلطنت کے راز افشا کرنے شروع کر دئے

جرمنی میں ہٹلر کے برسر اقتدار ہو جانے کے راز کو سمجھنے کے لئے حسب ذیل تین اہم واقعات کا ذکر بھی ضروری ہے۔

(۱) پیپن۔ شلیشر (Schleicher) اور ہنڈنبرگ کی سازش

(۲) ریشتاغ (جرمن پارلیمنٹ) کی آتشزدگی

(۳) ۳۰ جون کا قتل عام

۱۹۳۲ء میں پریسیڈنٹ ہنڈنبرگ کی عمر ۸۵ برس کی ہو چکی تھی اور اس کے قوا بہت مضمحل ہو گئے تھے اور وہ اپنے لڑکے آسکر، اپنے سکریٹری مسنر (Meissner) اور جنرل شلیشر کے ہاتھ میں تھا۔ ان لوگوں نے ہنڈنبرگ کو اپنے قبضہ میں رکھنے کے لئے صورت حال یہ پیدا کر دی تھی کہ کوئی شخص ہنڈنبرگ سے اسوقت تک نہ مل سکتا تھا جب تک یہ نہ چاہیں۔ پھر چونکہ یہ لوگ ہٹلر سے خائف تھے اس لئے نازیوں کو ہنڈنبرگ کی بارگاہ میں حضوری کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اس گروہ کی طاقت اس وجہ سے اور بڑھ گئی کہ ریشتاغ کا اجلاس اول تو بہت کم ہوتا تھا اور کبھی ہوتا بھی تھا تو

بغیر کوئی خاص قانون بنائے عموماً ختم ہو جایا کرتا تھا ——— اس کے علاوہ چانسلر مقرر کرنے اور ریشتاغ کو معزول کرنے کا اختیار صرف پریسیڈنٹ کو حاصل تھا اور وہ انھیں لوگوں کے ہاتھ میں تھا۔ ان گروہ بندیوں کا آخر میں یہ نتیجہ نکلا کہ ہر پارٹی نے اپنے اپنے جاسوسوں کے ذریعہ سے دوسری پارٹیوں کے اندرونی راز معلوم کرنے کی کوشش شروع کر دی

برونگ، ہیپن، شلیشر ڈاکٹر ہنری برونگ مئی ۳۰ء سے مئی ۳۲ء تک جرمنی کا چانسلر رہا۔ برونگ، موجودہ جرمنی کا سب سے زیادہ روشن خیال اور مہذب مدبر تھا۔ اس نے ویمر کے دستور اساسی کو محفوظ رکھا، ہنڈنبرگ کو دوبارہ صدر جرمنی منتخب کرانے کا باعث ہوا، خاکی پوشوں کو جلاوطن کر دینے کی جرأت کی، آسٹریا اور جرمن محصولوں کو متحد کر کے جرمنی کو خارجی حکمت عملی میں فتح دلائی خرچۂ جنگ کے مسئلہ کو تقریباً حل کر دیا لیکن آخر کار پریسیڈنٹ ہنڈنبرگ کے ہاتھوں کتے کی طرح عہدۂ چانسلری سے علٰحدہ کر دیا گیا!

برونگ کو ہٹلر سے سخت نفرت تھی وہ اپنی چانسلری کے دوران میں ہٹلر کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکنے کی برابر کوشش کرتا رہا۔ مگر اس کے باوجود ہٹلر کو روز بروز زیادہ قوت حاصل ہوتی گئی یہاں تک کہ ۳۰ء میں ہٹلر کی پارٹی کو الکشن میں ...... ۶۴ ووٹ ملے اور پارلیمنٹ میں نازی پارٹی کے ۱۰۷ نمائندے پہونچ گئے، اب ہٹلر کی ہستی جرمنی کی بساطِ سیاست پر ایک معمولی مہرے کی سی نہ تھی بلکہ اس کے حریفوں کو اس سے خطرات پیدا ہو چلے تھے اور برونگ بھی اس کو زیر کرنے کی مختلف تدابیر میں مصروف تھا، مگر اتفاق دیکھئے کہ خود برونگ کی یہ تدبیریں ہٹلر کے موافق ثابت ہوئیں ——— برونگ نے ملک کو اندرونی خلفشار سے بچانے کے لئے نیک نیتی سے خود ہی آئین جرمنی کی خلاف ورزی شروع کی اور اس کا نتیجہ اس کے حق میں خراب نکلا۔ ۳۰ء میں محض اس خیال سے کہ وہ اپنی رائے کے مطابق تمام ملک پر حکومت کر سکے، برونگ نے ریشتاغ کو برخاست کر دیا اور خود ریشتاغ نے اُسے اس طرح حکومت کرنے کی اجازت دیدی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جرمن پارلیمنٹ میں "سوشل جمہور" پارٹی سب سے بڑی پارٹی تھی۔ یہ جماعت اگرچہ برونگ کو زیادہ پسند نہ کرتی تھی مگر دوسری جماعتوں کے مقابلہ میں اُسے ضرور ترجیح دیتی تھی۔ الغرض برونگ خود مختارانہ حکومت کرنے لگا اور جو صرف صدر جرمنی کے رحم و کرم پر موقوف تھی۔

دو سال تک تو کسی نہ کسی طرح کام چلتا رہا لیکن اس کے بعد ۳۲ء میں ہنڈنبرگ پارٹی کے نزدیک، برونگ کی ضرورت بھی باقی نہ رہ گئی۔ خاکی پوش اور سوشلسٹ تو اُس سے خوش تھے ہی نہیں ہنڈنبرگ پارٹی بھی اُس کے ایک زرعی سمجھوتہ کے پروگرام سے ناراض ہو گئی۔ مئی ۳۲ء میں ہنڈنبرگ کو اس کی ریاستِ نوڈک (Neudeck) بھیجدیا گیا اور اس کے لڑکے آسکر کے ساتھ جنرل شلیشر نے خفیہ نامہ و پیام کا سلسلہ جاری کر دیا۔ نوڈک میں ہنڈنبرگ کو یہ یقین دلا دیا کہ برونگ ایک "زرعی بالشویک" ہے چنانچہ جب برونگ، ایک مرتبہ اُس کے پاس اس غرض

ے گیا کہ اُس کے اختیارات میں کچھ اور توسیع کردی جائے تو ہنڈنبرگ نے صاف انکار کردیا

اس تمام سازش میں جنرل شلیشر کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ وہ اسوقت وزیر تحفظ تھا اور فوج کا نمائندہ۔ لیکن جب ہنڈنبرگ نے برونگ کو چانسلری سے برخاست کیا تو شلیشر کو نہیں بلکہ پیپن کو چانسلر بنایا۔ کیونکہ خود شلیشر نے پیپن کو چانسلری کے لئے پیش کیا تھا! اور چند دن بعد ہنڈنبرگ کو پیپن پر اتنا اعتماد ہوگیا کہ پیپن بسا اوقات ہنڈنبرگ ہی کے ساتھ ناشتہ کرتا اور ہنڈنبرگ کے محل میں اس طرح آتا جاتا گویا وہ ہنڈنبرگ کا کوئی عزیز ہے مگر ملک اُسے ناپسند کرتا تھا۔ چنانچہ ویمر کے دستور اساسی کے مطابق جب عہدہ چانسلری ملنے کے بعد پیپن کو الکشن کرنا پڑا۔ تو ہٹلر کی پارٹی کو سب سے زیادہ ووٹ ملے اور آخر کار بڑی جماعت کے لیڈر ہونے کی حیثیت سے ہٹلر کو ہنڈنبرگ نے طلب کیا۔ ہنڈنبرگ سے ہٹلر نے اپنے شرائط پر چانسلری ملنے کا مطالبہ کیا اور جو حقوق مسولینی نے روما پر مارچ کرنے کے بعد طلب کئے تھے وہی ہٹلر نے بھی طلب کئے مگر ہنڈنبرگ نے انکار کردیا۔ اب ہٹلر نے یہ کوشش کی کہ جرمن پارلیمنٹ کے اجلاس میں پیپن کو شکست دی جائے مگر ستمبر ۱۹۳۲ء کا اجلاس شروع ہوتے ہی پیپن نے پارلیمنٹ کو برخاست کردیا۔ پارلیمنٹ کو برخاست کردینے کے بعد پیپن کو نومبر میں پھر الکشن کرانا پڑا مگر اس مرتبہ پھر اُسے شکست ہوئی۔ پارلیمنٹ کا اجلاس دوسری مرتبہ شروع ہوا مگر تین ہی دن کے بعد یہ پارلیمنٹ پھر برخاست کردی گئی۔ اب تمام ملک روز روز کے الکشنوں سے عاجز آچکا تھا اس لئے برلن میں اشتراکیوں نے ٹریفک کا اسٹرائک کردیا اور نازیوں نے ان کا ساتھ دیا۔ اس کے بعد دونوں نے مل کر یہ دھمکی دی کہ یہ ہڑتال تمام ملک میں عام کردی جائے گی۔ آخر کار ہنڈنبرگ اور شلیشر سب کو مجبور ہونا پڑا اور پیپن کی چانسلری ختم کردی گئی۔ اب کی مرتبہ خود شلیشر کو یہ مجبوری عنان چانسلری سنبھالنا پڑی۔ اصل میں اس کی تو خواہش یہ تھی کہ وہ پس پردہ کام کرے اور چانسلر خود اسی کی مرضی کے مطابق چلتا رہے لیکن دقت یہ پڑی کہ اب اُسے کوئی آدمی دکھائی نہیں پڑتا تھا، چنانچہ اُسے یہ عہدہ خود ہی قبول کرنا پڑا۔

شلیشر اعتدال پسند شخص تھا، اس لئے اُس نے نہایت معتدل قدم اُٹھایا۔ وہ ہر چند ایک حد تک مزدوروں کا حامی بھی تھا مگر ہٹلر کو وہ سخت ناپسند کرتا تھا چنانچہ اُس نے یہ اعلان کیا کہ وہ نہ سوشلسٹ ہے نہ سرمایہ دار۔ اُس نے برونگ کی زرعی اسکیم کی بھی تائید کی مگر عوام اور ہنڈنبرگ دونوں اُس سے ناراض ہوگئے۔ اُس کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ سابق چانسلروں کی طرح وہ بھی ہٹلر سے کوئی سمجھوتہ کرنا نہیں چاہتا تھا اور جس پارٹی کو ملک میں سب سے زیادہ ہردلعزیزی حاصل ہوگئی ہو اس کی مخالفت کرکے حکومت کرنا ناممکن ہے۔ شلیشر بھی اس نکتہ کو جانتا تھا مگر چونکہ اُسے ہٹلر سے عداوت تھی اس لئے بجائے اس کے کہ وہ ہٹلر سے مصالحت کرے، اُس نے خود نازی پارٹی کے اندر پھوٹ ڈالنی چاہی۔ اسوقت ہٹلر کی سیاسی انجمن کا افسر اعلیٰ اسٹرسیر تھا جس کے قبضہ میں ۳۰۔۴۰ نازی ڈپٹی تھے۔ شلیشر نے اُس کے ساتھ خفیہ سمجھوتہ کرنا شروع کیا۔ ہٹلر کو پتہ چل گیا۔ مگر اس نے اسٹرسیر کو جماعت

سے خارج کردینے کے بجائے نازی ڈپٹیوں کا ایک جلسہ منعقد کیا جس میں اسٹرآسیر بھی موجود تھا اور یہاں اس نے اسٹرآسیر کی غداری کو ظاہر کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شلیشر اور اسٹرآسیر کی اتحادی اسکیم ختم ہو گئی

اِس وقت اگر ہٹلر چاہتا تو ملک میں خانہ جنگی شروع کرا سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا کیونکہ وہ قانونی طور پر طاقت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پیپن کے پاس کوئی جماعت اپنی نہیں تھی اس لئے اُس نے پہلے تو سرمایہ دار جماعت کے لیڈر ڈاکٹر ہگنبرگ سے اتحاد کیا اور پھر ہٹلر کے پاس پہونچا۔ اب صورت یہ پیدا ہو گئی تھی کہ شلیشر چاہتا کہ پیپن اور ہگنبرگ دونوں کو گرفتار کرکے ملک میں فوجی ڈکٹیٹرشپ قایم کرنا چاہتا تھا۔ پیپن یہ سن کر ہٹلر کے پاس پہونچا اور اُس سے کہا کہ اگر میرے ساتھ سمجھوتہ نہیں کرتے ہو تو ہم تم دونوں تباہ ہو جائیں گے اور شلیشر ہم دونوں کو گرفتار کرکے ملک میں اقتدار حاصل کرے گا اور پھر نازی پارٹی بھی فنا ہو جائے گی۔ یہ بات ہٹلر کی سمجھ میں بھی آ گئی اور بادل ناخواستہ اُس نے یہ شرط منظور کر لی کہ کابینہ میں ۳ وزرا ہٹلر کی پارٹی کے رہیں اور آٹھ پیپن یا ہگنبرگ کے اس کے بعد ہٹلر اور ہگنبرگ نے ہنڈنبرگ کے سامنے نئی کابینہ کی تجویز پیش کی جسے صدر جرمنی نے منظور کرکے ہٹلر کو چنسلر اور پیپن کو وائس چنسلر مقرر کر دیا۔ جب یہ تقرر ہو چکے تو دوسرے دن شلیشر کو معلوم ہوا کہ اس کی حکومت ختم ہو چکی ہے!

جرمن پارلیمنٹ کی آتشزدگی

۵ مارچ ۱۹۳۳ء کو ہٹلر کی چنسلری کو مصدق کرنے کے لئے الکشن ہونیوالا تھا اس سے ۶ دن قبل یعنی ۲۷ فروری ۱۹۳۳ء کو جرمن پارلیمنٹ کی عالیشان عمارت میں آگ لگی اور اس عمارت کے ساتھ ہی جرمن جمہوریت کا بھی خاتمہ ہو گیا!! اس آگ نے صرف پارلیمنٹ کی عمارت ہی کو نہیں جلایا بلکہ اشتراکیوں جمہوریت پسندوں، کیتھولک اور قوم پرست جماعتوں کو بھی راکھ کر دیا! اس آگ کو لگے ہوئے ۵ برس ہو چکے ہیں مگر اس کے انگارے اب بھی روشن ہیں! اس آگ نے ایک شاندار عمارت ہی کو تودہ خاک نہیں بنایا بلکہ ہزاروں سکون پسندوں، لبرلوں، جمہوریت پسندوں اور ہزاروں صائب الرائے اشخاص کی تمام زندگی کے کارناموں کو ملیامیٹ کر دیا۔ اس آگ کے شعلوں کے ساتھ، بسمارک، ولیم ثانی اور آئین ویمر کی قدیم جرمن بھی جل کر خاک ہو گیا اور اس کے دھوئیں سے ہٹلر کی تیسری پارلیمنٹ پیدا ہوئی!

اُس وقت جرمنی کی سیاسی فضا یہ تھی کہ گو ہٹلر چنسلر بنا دیا گیا تھا مگر کابینہ میں اس کی جماعت کے صرف ۳ آدمی تھے اور پیپن۔ ہگنبرگ کے آٹھ۔ ہٹلر اپنی قوت قایم کرنے کے لئے چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کو اکثریت حاصل ہو جائے، دوسری طرف پیپن ہگنبرگ یہ چاہتے تھے کہ ایسا نہ ہونے پائے ورنہ ان کی پوزیشن کمزور ہو جائیگی یعنی بظاہر تو وہ ایک ہی پلیٹ فارم پر کام کر رہے تھے لیکن دراصل دونوں میں سخت اختلاف تھا اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسری طرف ہنڈنبرگ ابھی تک ہٹلر سے مطمئن نہیں ہوا تھا اور نازیوں کا یہ خطرہ بھی لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں ان کی جماعت الکشن میں شکست نہ پا جائے۔ نازیوں کا اندازہ یہ تھا کہ

۶۰۰ ممبروں کی پارلیمنٹ میں ۲۵۰ نشستیں انھیں مل جائیں گی مگر اکثریت حاصل کرنے کے لئے نصف سے زاید یعنی ۳۰۰ سے زیادہ نشستیں انھیں حاصل کرنا تھیں۔ یہ بھی خیال تھا کہ اشتراکی جماعت کو ۱۰۰ نشستیں ضرور ملجائینگی لہذا ترکیب یہ سوچی گئی کہ کسی طرح ان اشتراکیوں کا خاتمہ کر دیا جائے اور ان کی ۱۰۰ نشستوں پر قبضہ کرکے پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کرلی جائے۔ الکشن کا دن بالکل سر پر آرہا تھا اور نازیوں کو کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ آخر انھوں نے کچھ کیا اور اس آتشزدگی سے وہی نتیجہ نکلا جس کی انھیں امید تھی۔ یعنی اس آتشزدگی کا الزام اشتراکی جماعت پر قایم کیا گیا اور ایک سو اشتراکی ممبران پارلیمنٹ گرفتار کرلئے گئے۔

اس واقعۂ آتشزدگی کے اندرونی حالات ابھی تک لوگوں کو اچھی طرح معلوم نہیں ہیں کیونکہ نازیوں نے اپنا کام اتنی ہوشیاری سے کیا کہ گو دنیا کو اس واقعہ کے سلسلہ میں ان کی سازش پر شک ضرور ہوا مگر تفصیلات کسی کو نہ معلوم ہوسکیں۔ بہرحال یہاں ان "اسرار" پر ایک ہلکی سی نظر ڈالنا نامناسب نہ ہوگا

آتشزدگی کی رات کو ایک ڈچ جو تقریباً دیوانہ تھا گرفتار کرلیا گیا۔ اُس کا نام میرینس خان ڈربلے (Marinus van der Lubbe) تھا اس کے متعلق سرکاری بیانات یہ شائع ہوئے کہ اس کے پاس اشتراکی جماعت کی ممبری کا کارڈ ملا اور ایک اشتہار جس میں اشتراکیوں اور اجتماعیوں میں متحد ہوکر کام کرنے کی اپیل کی گئی تھی، نیز خود اس کے کئی فوٹو اور ایک پاسپورٹ بھی دستیاب ہوا لیکن بعد کو دوران مقدمہ میں یہ ثابت ہوگیا کہ اسکے پاس پاسپورٹ (پروانۂ راہداری) تو ضرور تھا مگر اور جن چیزوں کا تذکرہ کیا گیا تھا وہ دستیاب نہیں ہوئی تھیں۔ دوران مقدمہ میں یہ ثبوت بھی بہم پہونچایا گیا کہ اُس نے اس سے قبل تین جگہ اور آگ لگائی تھی اور وہ ڈچ اشتراکی نوجوانوں کی جماعت کا ممبر تھا مگر دو برس کے بعد جماعت سے خارج کر دیا گیا تھا

الغرض جرمن پولیس نے یہ تسلیم کرلیا کہ آگ لگانے والا لبے تھا مگر اس کے ساتھ اور لوگ بھی شریک تھے۔ چنانچہ چند آدمی اور بھی ماخوذ کئے گئے لیکن شہادت فراہم نہ ہونے کی وجہ سے وہ چھوڑ دئے گئے اور لبے کو پھانسی دیگئی۔ آگ کے ماہرین نے شہادت میں یہ ثابت کر دیا تھا کہ آتشزدگی میں آگ لگا دینے والے کیمیاوی اجزا مثلاً فاسفورس، سلفر اور پٹرول کافی مقدار میں استعمال کئے گئے اور ظاہر ہے کہ لبے، اکیلا اتنی چیزیں اندر نہیں لیجا سکتا تھا، دوسرے گرفتاری کے وقت اس کے پاس سے آگ لگانے کا بہت تھوڑا سا سامان ملا تھا۔ خود لبے، نصف اندھا تھا اور ٹٹول ٹٹول کر چل سکتا تھا۔ دوسری طرف پارلیمنٹ کی عمارت میں بالکل اندھیرا چھایا ہوا تھا اور اس واقعہ سے قبل چونکہ وہ عمارت میں کبھی داخل نہیں ہوا تھا اس لئے وہ اس کی ساخت سے بھی واقف نہ تھا کہ اندھیرے میں خاص خاص جگہوں تک پہونچ سکتا

لیکن لبے نے آخر وقت تک ظاہر نہیں کیا کہ نازیوں نے اُسے اس کام پر مامور کیا تھا اس لئے سوال یہ پیدا

ہوتا ہے کہ اگر نازی سازش کے بغیر لبے نے آگ لگائی تو وہ اکیلا اس میں کامیاب کیسے ہوا اور اگر نازی سازش سے اُس نے آگ لگائی تو کسی نازی کا نام کیوں اس سلسلہ میں نہیں لیا؟

بات یہ ہے کہ فان ڈر لبے، موجودہ تہذیب کا ایک بدقسمت فرد تھا جس کے نہ گھر تھا نہ بار، اُسے دورِ جدید کی سوسائٹی اور حکومتوں سے نفرت تھی اور اس نفرت کی پیاس کو وہ مکانوں میں آگ لگا لگا کر بجھایا کرتا تھا۔ برلن میں وہ کئی جگہ آگ لگا چکا تھا اور اس نے اس کا تذکرہ بھی کئی آدمیوں سے کیا تھا۔ نازیوں کو بھی اُس کا حال معلوم ہوگیا۔

لبے نے اپنے یار دوستوں سے آگ لگنے سے دو ایک دن پہلے یہ کہا تھا کہ میں فلاں روز پارلیمنٹ میں آگ لگاؤں گا۔ برلن جاسوسوں سے بھرا ہوا ہے۔ لبے کے یہ الفاظ نازیوں تک پہونچے۔ وہ پہلے ہی سے کوئی قربانی کا بکرا ڈھونڈھ رہے تھے۔ لبے بیٹھے بٹھائے مل گیا۔ بہرحال نازی بھی اُسی رات کو ڈاکٹر گورنگ کے مکان کی سرنگ کے راستہ سے پارلیمنٹ میں داخل ہوئے۔ لبے نے آگ لگائی مگر اُس کا زیادہ اثر نہیں ہوا اور اس کے ساتھ ہی فوراً نازیوں نے دوبارہ خود باقاعدہ آگ لگادی۔ لبے آگ لگا کر باہر نکلا تو دیکھا کہ سارا ہال جل رہا ہے۔ وہ یہ سمجھا کہ یہ سب اُسی کی کرامت ہے اس آتش زدگی کو وہ اپنے لئے قابلِ فخر سمجھتا تھا چنانچہ گرفتاری کے بعد سے وہ برابر پارلیمنٹ کی عمارت کے جلنے کا ذمہ دار اپنے آپ کو بتاتا رہا اور اس سے ہمیشہ انکار کیا کہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی شریک تھا۔ یہ وہ نظریہ ہے جس کی ڈمیٹراف نے بھی تائید کی ہے!

قتلِ عام چانسلر ہونے کے بعد ہٹلر کے پاس دو فوجیں تھیں۔ ایک تو جرمنی کی باقاعدہ فوج (Reichswehr) دوسرے ہٹلر کی پرائیویٹ خاکی پوش، فوج جس کا کپتان ہٹلر کا عزیز دوست روہم تھا۔ ہٹلر اب چاہتا تھا کہ ان دونوں فوجوں میں سے صرف ایک فوج کو اختیارات حاصل رہیں اور اس کے لئے اُس نے باقاعدہ فوج کو ترجیح دی اس مقصد کے لئے خاکی پوش فوج کی قوت کو توڑ دینا ضروری تھا ——— یہ ہے ۳۰ جون ۱۹۳۴ء کے قتلِ عام کا راز!

قتل کی بنیاد مئی اور جون ۱۹۳۴ء میں برلن کی سیاسی فضا بہت مکدر ہو رہی تھی۔ انقلاب ہو چکا تھا یعنی نازیوں کو اقتدار حاصل ہوگیا تھا لیکن اس انقلاب اور فتح کا پھل نہیں ملا تھا۔ لوگ نازی اقتصادی پروگرام کو عملی صورت میں دیکھنے کے منتظر تھے، انتہا پسند نازی یہ سمجھنے لگے تھے کہ سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں نے نازی لیڈروں کو اپنے دامِ فریب میں پھنسا لیا ہے۔ انھوں نے ناامید ہو کر ہٹلر سے اپیل کی مگر بے سود!

خاکی پوش بھی غیر مطمئن تھے۔ وہ اپنے آپ کو نازی پارٹی کا رکن رکین سمجھ رہے تھے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہی لوگ تھے جو ہٹلر کو اس درجہ پر پہونچانے کا باعث ہوئے تھے۔ اس میں بائیں بازو (Left wing) کے

کئی ایسے آدمی تھے جو نازی اقتصادی پروگرام پر جلد از جلد عمل دیکھنا چاہتے تھے۔

خاکی پوشوں کی تعداد ۲۵ لاکھ تک پہونچ چکی تھی لیکن انقلاب مکمل ہو جانے کے بعد ان کا کوئی کام نہیں رہگیا تھا۔ ہٹلر کی خود سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب وہ کیا کرے۔ پارٹی کو اب ان کا خرچ برداشت کرنا تکلیف دہ معلوم ہو رہا تھا۔ نیز ان کی جگہ ہٹلر اور دوسرے نازی لیڈروں کی حفاظت کے لئے بطور باڈی گارڈ ایک دوسری پرائیویٹ فوج سیاہ پوش بنائی گئی تھی

خاکی پوشوں کا سپہ سالار روہم تھا۔ جس سے وہ بہت محبت کرتے تھے۔ ان خاکی پوشوں کے متعلق جو صورت حال پیدا ہو گئی تھی اس کا روہم نے یہ حل سوچا کہ انھیں جرمنی کی باقاعدہ فوج میں شامل کر کے ایک نئی قومی فوج تیار کی جائے جس کا سپہ سالار اعلیٰ خود روہم ہو

لیکن جرمن فوجی افسر اس کے لئے تیار نہ تھے۔ اول تو وہ اپنی جگہ روہم کو دینے پر رضامند نہیں تھے۔ دوسرے وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ انھوں نے جو ایک لاکھ مسلح اور منظم سپاہی تیار کئے ہیں ان میں ۲۵ لاکھ غیر منظم ناتجربہ کار سڑک کے لونڈے، دفتروں کے کلرک، اور ملک کے بچے لفنگے شامل کر دئے جائیں

ادھر ہٹلر ہر چند روہم کو اپنے ہاتھ سے دینے کے لئے تیار نہ تھا مگر دوسری طرف وہ ایک لاکھ مسلح اور منظم فوج کو بھی نظر انداز نہ کر سکتا تھا۔ ہٹلر نے ایک مرتبہ پھر روہم کو اپنے پاس بلایا اور روہم نے پھر اُسے وہی مشورہ دیا مگر ہٹلر نے نہیں مانا اور اس کے بعد ہی یہ حکم دیا کہ یکم جولائی سے خاکی پوش ۲ ماہ کی رخصت پر رہیں گے جس کے دوران میں وہ اپنا یونیفارم نہیں پہن سکتے!

اس سلسلہ میں ایک اور چیز بھی غور کے قابل ہے۔ خاکی پوشوں کے علاوہ ایک اور نازی فوج تیار کی گئی تھی، جسے 'سیاہ پوش'، (ss) یا (Schutzstaffel) کہا جاتا تھا۔ یہ فوج 'گارڈ' کا کام دیتی تھی اور اس کی تعداد ۲ لاکھ تھی۔ اس فوج کا روہم سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ اس کا سردار ہملر نامی ایک شخص تھا جسکو روہم سے عداوت تھی!

قتل عام سے ایک رات قبل ہٹلر، مزدوروں کے ایک کیمپ کا معائنہ کرنے کے بہانہ جنوبی جرمنی چلا گیا۔ اُس کے ساتھ گوبلس اور لٹزے نامی ایک اور آدمی تھا۔ برلن میں 'باغیوں' کا قتل گوئرنگ کے سپرد کیا گیا تھا۔ گوئبلس اپنے ایک بیان مطبوعۂ اخبار 'منچسٹر گارجین' میں لکھتا ہے کہ قتل کی ایک رات قبل 'لیڈر' کو بغاوت کی اطلاعیں موصول ہوئیں۔ اُس نے فوراً یہ فیصلہ کر لیا کہ اس کا تدارک کس طرح کرنا چاہئے چنانچہ ہم لوگ راتوں رات میونخ پہونچے اور صبح ۷ بجے ہٹلر بذات خود روہم کی جائے قیام پر پہونچا اور اُسے گرفتار کر لیا

سوال یہ ہے کہ اگر روہم کسی بغاوت کی تیاری کر چکا تھا تو وہ میونخ سے ۴۰ میل کے فاصلہ پر اطمینان سے اپنے

گھر پر لیٹا ہوا کیوں سو رہا تھا۔ دوسرے اس میں کیا عقلمندی تھی کہ میونخ میں جس روز بغاوت کی تیاریاں ہو رہی ہوں ہٹلر اُسی دن وہاں پہونچ جائے اور اُسے اپنے لئے کوئی خطرہ نہ نظر آئے؟ بہرحال روہم گرفتار کر کے میونخ لایا گیا اور اُسے حکم دیا گیا کہ خود اپنے گولی مارے مگر روہم نے انکار کیا اور کہا کہ مجھے بجز ہٹلر کے اور کوئی نہ مارے۔ جیلر بار بار ہٹلر کے پاس آتے اور پوچھتے کہ روہم کے ساتھ کیا کیا جائے۔ آخر ہٹلر نے دل مضبوط کر کے اس کے قتل کا حکم دے ہی دیا! اس کے ساتھ ہی جب میونخ میں مخالفین، کا قتل ہو چکا تو برلن میں گوئرنگ کو اطلاع دی گئی کہ وہ اپنا کام شروع کرے۔ ان قتلوں کے بارہ میں ہٹلر کے احکام صاف نہ تھے مگر گوئرنگ نے جسے مناسب سمجھا قتل کرنا شروع کر دیا

شلیشر کو بھی اس کے گھر میں جب وہ کسی سے ٹیلیفون پر گفتگو کر رہا تھا قتل کیا گیا اور جب شور کی آواز سُن کر اس کی بیوی دوڑی آئی تو اُسے بھی گولی مار دی گئی تاکہ اس کے شوہر کے قتل کی کوئی شہادت نہ رہ جائے۔

باقی لوگوں کا 'کورٹ مارشل' ہوا جس میں ان سے صرف یہ کہا گیا کہ تمھیں بغاوت کے جرم میں موت کی سزا دی جاتی ہے اور پھر گولی مار دی گئی

بعض آدمیوں کے نکل بھاگنے کی داستان

اس قتل عام میں بعض لوگوں کے نکل بھاگنے کی داستان بھی بہت دلچسپ ہے۔ مثلاً ایک شخص، ٹری ورانس سے نازی اس لئے دشمن ہو گئے تھے کہ وہ (۱) بروننگ کا خاص دوست تھا (۲) فوج میں اس کا کافی اثر تھا (۳) ہٹلر سے وہ عداوت رکھتا تھا اور اس کا اظہار علی الاعلان کیا کرتا تھا

اس کو قتل کرنے کے لئے ایک درجن سیاہ پوش ایک لاری میں بیٹھ کر ریوالور ہاتھ میں لئے اُس کے گھر پہونچے ٹری ورانس اس وقت لنچ کھا کر اپنے گھر ہی میں ٹینس کھیل رہا تھا۔ ان سیاہ پوشوں کو پہلے ٹری ورانس کا ایک لڑکا ملا تو انھوں اُس سے چلا کر پوچھا کہ ٹری ورانس کہاں ہے۔ اتفاق سے ٹری ورانس کا باپ کوٹھے پر بیٹھا تھا اُس نے یہ گفتگو سن کر کہا۔ کیا ہے۔ "میں یہاں ہوں" سیاہ پوش اوپر دوڑے مگر وہاں ٹری ورانس کے باپ کو پایا۔ اتنے میں لڑکے نے اپنے باپ سے سارا واقعہ بیان کر دیا تھا، وہ یہ سنتے ہی اپنی موٹر پر سیدھا شہر کی طرف بھاگا۔ سیاہ پوشوں نے بھی اس کا پیچھا کیا مگر چونکہ سڑکوں پر کافی آدمی چل رہے تھے اس لئے سر راہ وہ اُس پر گولی نہ چلا سکے اور ٹری ورانس پہلے سیاہ پوشوں کی نظر سے بچ کر اور کسی راستہ سے ہوتا ہوا شلیشر کے گھر پہونچا۔ یہاں اُسے معلوم ہوا کہ وہ بھی قتل کر دیا گیا تو وہ وہاں سے بھاگ کر کسی گاؤں کی سڑک کی طرف گیا اور وہاں اپنا موٹر ایک درخت سے لڑا کر تاکہ یہ سمجھا جائے کہ وہ کسی گاؤں میں چھپا ہے بذریعہ ٹیکسی پھر شہر میں داخل ہوا اور ایک دوست کے یہاں جا کر چھپ رہا

بعض انگریزوں نے بھی جو نازیوں کے مخالف تھے، معتوبین کو اپنی جانیں بچانے میں مدد دی اور بعضوں نے تو ان کو اپنے پاسپورٹ دے دئے کہ وہ جرمنی سے بھاگ جائیں

ہنڈنبرگ کی موت

اُسی سال، ۲ اگست کو ہنڈنبرگ کا انتقال ہوا۔ ہوسکتا ہے کہ اُسے اس قتل عام سے بہت صدمہ پہونچا ہو مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے بھی اسے پسند کیا تھا کیونکہ ہٹلر اور گوئرنگ دونوں کو اُس نے مبارکباد کے تار بھیجے تھے!

ہنڈنبرگ کے مرنے کے بعد بلکہ ایک دن قبل ہی سے چہ میگوئیاں شروع ہوگئی تھیں کہ اس کے بعد جرمنی کا صدر کون ہوگا۔ کیا ہٹلر خود ہی صدر بن جائے گا؟ اگر ایسا ہوا تو چنسلر کون ہوگا اور فوج کا کیا حشر ہوگا؟۔ مگر ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہٹلر نے فوج کو پہلے ہی اپنا طرفدار بنالیا تھا۔ چنانچہ ہنڈنبرگ کے مرنے کے دوسرے ہی دن ہر فوجی سپاہی اور افسر نے جرمن پارلیمنٹ و جرمن قوم کے لیڈر، اور فوج کے سپہ سالار اعظم، اڈالف ہٹلر، کے ساتھ وفادار رہنے کی قسم کھائی۔ بعض افسروں نے جو ہٹلر کو ناپسند کرتے تھے اُس دن بیماری کی رُخصت لے لی مگر رخصت ختم ہونے کے بعد پھر ان سے حلف وفاداری لیا گیا۔ حلف کے بعد سب نے نازی قومی ترانہ بھی گایا

ہنڈنبرگ کی زندگی تک اس کا امکان تھا کہ ممکن ہے وہ ہٹلر کو چنسلری سے برخاست کردے مگر اس کی موت کے ساتھ ہی یہ خدشہ بھی جاتا رہا۔ اور اب اُسے معزول کرنے والا بجز خدا کے کوئی نہیں رہگیا تھا مگر ہٹلر کا دعویٰ تھا کہ خدا بھی اُسی کے ساتھ ہے!!

"نگار" کے پُرانے پرچے

نگار کے مندرجۂ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کرلیں، قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:۔

(۲۲ء) ستمبر ۴؍۔ (۲۶ء) جنوری۔ جون۔ نومبر ۵؍ فی پرچہ ۔ (۲۷ء) اپریل۔ مئی و جون ۴؍ فی پرچہ (۲۹ء) دسمبر ۵؍۔ (۳۰ء) مئی ۴؍۔ (۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴؍ فی پرچہ ۔ (۳۲ء) فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل) ۴؍ فی پرچہ ۔ (۳۳ء) فروری۔ جولائی و اکتوبر ۴؍ فی پرچہ ۔ (۳۴ء) مارچ ۴؍۔ (۳۵ء) نومبر ۵؍۔ (۳۶ء) فروری۔ مارچ۔ اپریل۔ جون۔ نومبر۔ دسمبر ۵؍ فی پرچہ ۔ (۳۷ء) مارچ۔ اپریل۔ مئی۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔ اکتوبر۔ نومبر و دسمبر ۸؍ فی پرچہ ۔

منیجر نگار لکھنؤ

اُردو غزل

(عنصرِ یاس و نشاط)

پروفیسر فراقؔ گورکھپوری کی دو تقریریں جو دہلی لاسلکی اسٹیشن سے نشر کی گئیں

(ا)

انگریزی میں قنوطیت کو (Pessimism) اور رجائیت کو (Optimism) کہتے ہیں۔ لاطینی میں (Pessimus) کے معنی ہیں بدترین (The worst) اور (Optimus) کے معنی ہیں بہترین (The best)۔ قنوطیت شعور انسانی کے اس انداز کا نام ہے جب حیات انسانی کوئی حقیقی خوشی، حقیقی قدر و قیمت، حسن و دلکشی یا کوئی تشفی بخش عنصر نہ پانے سے قطعی طور پر مایوس ہو جائے۔ انسانی شعور کے اس انداز نے دنیا بھر کے لٹریچر پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ مذہب اور فلسفہ دونوں اس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ہر مذاہب نے یہ تسلیم کرلیا کہ مادی وجود موہوم و بے سود ہے اور سوا غم و تکلیف کے دنیا میں کچھ نہیں۔ خصوصیت کے ساتھ بُدھ مذہب نے تو قطعی اور آخری طور پر فلسفیانہ قنوطیت کی طرف رہبری کی

فلسفۂ قنوطیت کے موجد تو نہیں لیکن سب سے مشہور نمایندے شوپنہار اور ہارٹمان گذرے ہیں۔ شوپنہار کو زندگی میں محض ایک اندھی قوت ارادی ملتی ہے جسکی کوئی منزل نہیں، کوئی نصب العین نہیں، وہ ہر جانب بے سوچے سمجھے بڑھتی رہتی ہے اور متضاد، متناقص اور متصادم رجحانات و حالات پیدا کر دیتی ہے۔ جس کا دوسرا نام زندگی ہے، شوپنہار اور ہارٹمان دونوں کہتے ہیں کہ یہ کائنات بدترین کائنات ہے اس سے بدتر کائنات کا وجود یا تصور ممکن ہی نہیں۔ شوپنہار نے تو فوراً خودکشی کر لینے کی ترغیب دی ہے۔ حالانکہ وہ خود تقریباً سو برس تک زندہ رہا لیکن اس کے قلم میں وہ مہلک اثر تھا کہ اس کے فلسفہ سے یورپ میں خودکشی کی وبا پھیل گئی تھی۔ کاش شوپنہار کے مریدوں نے ذوقؔ کا یہ شعر سُن لیا ہوتا

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اب رجائیت پر نظر ڈالئے۔ غالبؔ نے کہا تھا:- فریاد کی کوئی لے نہیں ہے ٭ نالہ پابندِ نے نہیں ہے

ہنسی خوشی کی بھی گلفشانیاں عجیب ہیں جس طرح غم و یاس کا احساس، طبعی، مذہبی اور فلسفیانہ ہو سکتا ہے اسی طرح رجائیت بھی افتادِ مزاج اور رنگِ طبیعت سے شروع ہو کر روحانی یا نفسیاتی اطمینان، مذہبی و فلسفیانہ سکون اور روح افزا و حیات پرور تجربات و احساسات سے ہمیں وجد میں لاتی ہے اور ہمارے حوصلے بڑھاتی ہے قنوطیت اور رجائیت کے تسلسل اور میل سے ایک فلسفہ اور پیدا ہوا جسے (Meliorism) یا (Evolutionism) یعنی ارتقائیت کہتے ہیں۔ اس فلسفہ کے مطابق دنیا دکھ درد کے منازل سے گزرتی ہوئی حقیقی زندگی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ کچھ دنوں سے ایک اور خیال بھی پیش کیا جا رہا ہے وہ یہ کہ زندگی نہ اچھی ہے نہ بری۔ اس خیال کے نمائندے کہتے ہیں کہ خوشی اور غم کائنات کے صفات میں نہیں ہیں، قدرت بے لوث ہے۔ وہ وجود محض ہے یا جمود محض

اُردو غزل کا کیا عالم ہے؟ اُردو غزل کا روحانی پس منظر ایران کی ہزار سالہ پرانی تہذیب اور اسلام کی آمیزش سے دو آتشہ ہو کر کئی صدیوں کا پُرانا ایرانی لٹریچر رہا ہے۔ یونان و روما اور ہندوستان کے خیالات کی آمیزش سے بھی اُردو غزل کی تعمیر ہوئی۔ اُردو غزل نے عاشقانہ اشعار میں، خمریات میں، تصوفانہ اشعار میں، گل و بلبل، جنون و ہوش بہار و خزاں، زنداں و صحرا، غرض اپنے تمام روایاتی عنوانات اور تمثیلوں کے ذریعہ سے اور متعدد موقعوں پر حیات و کائنات پر براہِ راست حکم لگا کر قنوطیت اور رجائیت کے متعلق لطیف سے لطیف، گہرے سے گہرے اور بلند سے بلند اشعار پیش کئے۔ یہ سچ ہے کہ دہلی میں جب اُردو شاعری نے آنکھ کھولی تو قومی حکومت اور قومی زندگی پر اُداس شام چھائی ہوئی تھی۔ ایک سودا کی ذات چھوڑ کر میر اور اُن کے جتنے ہمعصر تھے سبھی کے یہاں غم و یاس کا تیز اثر کارفرما ہے۔ ان کے جانشین غالب۔ مومن۔ ذوق اور ظفر کے یہاں غالباً ذوق کو چھوڑ کر جو بقول غالب بجائے میری کے سودائی تھے قنوطیت کا عنصر تیز ہے۔ اس کے برعکس لکھنؤ کی شاعری میں (حالانکہ بعد کو لکھنؤ پر بھی مرثیت چھا گئی) زندہ دلی اور رنگینی اور چہل پہل نظر آتی ہے۔ وہاں حکومت عروج پر تھی اور زندگی شباب پر۔ رجائیت اور جوش و خروش سرمستی اور نشاط زندگی کی جگمگاتی ہوئی مثالیں آتش کی غزلوں میں دیکھئے۔ رجائی شاعری کا آتش بادشاہ ہے اور بقول چکبست اس کے قلم سے شعر اس طرح نکلتے ہیں جیسے کمان سے تیر۔ اس کے بعد دلی میں داغ اور لکھنؤ میں امیر کا زمانہ آتا ہے۔ پھر پنجاب میں شاعری کا آفتاب طلوع ہوتا ہے اور لکھنؤ کا جذباتی اسکول مرثیت کو لکھنوی زبان کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ صوبۂ بہار میں شاد عظیم آبادی اپنے نغمہائے سرمدی سے فضا کو مرتعش کرتے ہیں اور ضلع غازی پور میں حضرت آسی۔

انھیں کانوں سے انا الحق کے سنے ہیں نعرے عشق میں آدمی کیا جانئے کیا ہوتا ہے
عشق کہتا ہے دو عالم سے جدا ہو جاؤ حسن کہتا ہے جدھر جاؤ نیا عالم ہے

پھر دورِ حاضر کا آغاز ہوتا ہے اور حسرت موہانی - اصغر گونڈوی - یاس یگانہ - جگر مراد آبادی - فانی بدایونی کی نوا سنجیوں سے فضائیں گونجنے لگتی ہیں - پچھلے سال پنڈت جواہر لال نہرو نے دورِ حاضر کا جایزہ لیتے ہوئے کانگرس کے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا کہ مغرب پر باوجود دولت و طاقت کے غم و یاس کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں اور مشرقی ممالک میں امید کی شعاعیں جگمگا رہی ہیں - ان شعاعوں کی جگمگاہٹ دورِ حاضر کی غزلگوئی میں بھی نظر آتی ہے ، اقبال کا ایک شعر ہے :-

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

اقبال ہی کا دوسرا شعر بھی سنئے جس میں مغربی تہذیب و تمدن کے دل کا چور اس نے پکڑ لیا ہے :-

قدحِ خرد فروغے کہ فرنگ داد ما را ہمہ آفتاب لیکن اثرِ سحر ندارد

لوگ کہدیتے ہیں کہ یورپ کی شاعری میں زندگی ہے - ابھار ہے ، حوصلہ ہے ، اور ایشیائی شاعری میں بیدلی ، بے حوصلگی اور کم ہمتی ہے ، مہاتما گاندھی نے کئی سال ہوئے کانگرس کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا کہ جمود بیداری معکوس کا نام ہے (Depression is only exitement turned inside out) ایک مثال لیجئے - کہا جاتا ہے کہ میر کے شعر سن کر منھ سے "آہ" نکلتی ہے اور سودا کے شعر سن کر "واہ" نکلتی ہے - لیکن کبھی آپ نے یہ بھی سوچا کہ ہر چند میر نے لاکھوں دردِ دل جمع کر کے ایک کائنات کی تعمیر کی اور سودا نے چہار دیوار قہقہہ اٹھائی لیکن سکون اور تشفیِ روح کے لئے حقیقی معنے میں نشاطِ زندگی کے لئے آپ میر کی دنیا میں رہنا پسند کریں گے یا سودا کی چہار دیواری میں ؟ اسی طرح مصحفی اگرچہ یاس انگیزی میں میر کا ہم پلہ تو نہیں لیکن دل شکستگی اور درماندگی کی چٹکیاں اس کے کلام میں بھی ہیں - اس لئے کیا ہم انشا کے ڈھول دھپے کو زندگی کا اُبھار سمجھیں اور کلام مصحفی کو اُسکی پستی ہاں انشا ، کا نام آتے ہی خیال آیا کہ یوں تو غم اور خوشی میں بعد المشرقین ہے لیکن ہنسنا اور رونا سب کو آتا ہے آنسوؤں اور قہقہوں کی حقیقت ایک ہے - جب زندگی کی چھیڑ چھاڑ کو چھوڑ کر زندگی کی آزمائشوں سے انشا کو دوچار ہونا پڑا تو اس نے وہ غزل کہی جس سے حقیقت کی رگیں بھی دکھ گئی ہوں گی :-

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

آتش کے یہاں نشاط کے ساتھ ساتھ سوز و گداز کی بھی کمی نہیں ، ناسخ کے یہاں بڑا بول ہے ، شکوہ الفاظ ہے ، دھوم دھام ہے - تو کیا زندگی بجائے آتش کے ناسخ کے یہاں ہے -

اس میں شک نہیں کہ دورِ حاضر کے پہلے اور چند مستثنیات سے قطع نظر کر کے اُردو غزلگوئی میں دنیا کی بے ثباتی زندگی سے بیزاری ، مجبوری ، پست ہمتی اور دعا مرگ کے خیالات کی بہتات رہی ہے - عاشقانہ شاعری میں بھی ناکامی اور محرومی و معشوق کی بے وفائی ، بے مہری ، تغافل اور لاپرواہی ، بے اعتباری اور بے اعتمادی ، فرقت اور رشک ، یاس و حسرت ، بیدلی و افسردگی کی تلخ نوائیاں زیادہ رہی ہیں - سنسکرت میں

علم بلاغت کی تعریف ایک شلوک میں یہ کی گئی ہے کہ شاعری وہ ہے جس میں خیر و برکت ہو جس میں شبھ اور منگل اور امرت ہو۔ سو رحمت، برکت اور آبِ حیات کی کمی اُردو غزل میں ضرور رہی ہے مگر فقدان نہیں رہا ہے۔ ہماری شاعری غمزدہ ہوتے ہوئے بھی یورپ کی شاعری کی بیزاری، بخار اور ہیجان (the weariness, the fever & the fret) سے آزاد رہی ہے۔ اُس نے حیات اور کائنات کو اتنا تلخ اتنا بیدرد اتنا بھیانک نہیں بنایا اور نہیں بتایا جتنا انگریزی اور یورپ کی دیگر زبانوں کی شاعری نے بتایا۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ اُردو غزل میں اکثر رونا پیٹنا، حالتِ نزع، بے موت مرنا ایک رسمی عنوان ہو گیا تھا۔ بجائے غم کے غم کی نقالی ہونے لگی تھی، بجائے خلوص احساس کے اپنے اوپر رحم کرنا اپنا پیدائشی اور سیاسی حق سمجھتے ہوئے تھے۔ غرض آہ و زاری ماتم و فریاد فیشن بن گئے تھے۔ غالب کہتا ہے:۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے ۔۔۔ آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اشعار حیات نما اور حیات آور نہیں۔ جس طرح فزکس میں جہاں رکاوٹ نہیں وہاں سہارا بھی نہیں (Where there is no resistance, there is no happiness) اسی طرح حیات میں بھی بغیر غم کے خوشی میں جان نہیں پڑ سکتی۔ ویدِ مقدس میں کائنات کی خلقت کا سبب ذاتِ ایزدی کا بیک وقت کرب و نشاط بتایا گیا ہے۔ جب سمندر کو دیوتاؤں اور شیاطین نے متھا اور اس میں سے نو رتن نکلے تو ان میں ایک رتن یعنی جوہر زہر بھی تھا۔ سب سہم گئے اور وشنو سے جو خوشی اور کائنات کی حفاظت کا دیوتا ہے کہا کہ اسے آپ پی لیں ورنہ وجودِ عالم نیست و نابود ہو جائے گا۔ وشنو نے جواب دیا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں۔ شیو سے کہو جو بیدردی کشت و خون اور بربادی کا خدا ہے جو دنیا کے مٹنے پر قہقہہ لگاتا ہے۔ سب شیو کے پاس گئے۔ شیو نے زہر پی لینا قبول کر لیا۔ ذاتِ ایزدی کرب سے مرتعش ہو گئی۔ شاعری چونکہ بڑی حساس چیز ہے اس لئے اس میں غم کا عنصر تیز ہونا ضروری ہے۔ شاعر جہاں حسن کا خلاق ہے اور بغیر سوز و گداز کے نہ حسن کا وجود تصور میں آسکتا ہے نہ حسن کا احساس۔ بقول آسی غازیپوری:۔ "چوٹ ہے جس میں عشق کی حسن ہے میرے یار کا"

غالب کے اس شعر میں نشاطِ زندگی کی جھلک دیکھئے:۔

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا ۔۔۔ سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

زندگی کی ناکامیوں کی تصویریں ان اشعار میں دیکھئے:۔

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز ۔۔۔ دعا قبول ہو یا رب کہ عمرِ خضر دراز

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب ۔۔۔ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ۔۔۔ ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

کوئی تدبیر بر نہیں آتی | کوئی صورت نظر نہیں آتی
پہلے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی | اب کسی بات پر نہیں آتی

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے | بھرے ہیں جسقدر جام وسبو میخانہ خالی ہی
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن | دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہی
غم اگرچہ جاں گسل ہی پہ بچیں کہاں کہ دل ہی | غم عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا
نہ گُل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز | میں ہوں اپنی شکست کی آواز

لیکن غالب داستانِ زندگی یہیں ختم نہیں کردیتا۔ سنئے:-

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں | ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

وہ ناخدا کو معاف کرنے کے بہانے اپنے خدا کو بھی معاف کردیتا ہے:-

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب | خدا سے کیا ستم وجورِ ناخدا کہئے

میرؔ کو تصویرِ غم کہا جاتا ہے یہاں ہم اس کے صرف وہ اشعار سنائیں گے جو رجائیت کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ کیا حافظ یا اقبال نے اس سے زیادہ حوصلہ افزا شعر کہے ہیں:-

ہیں مشتِ خاک لیکن جو کچھ ہیں میرؔ ہم ہیں | مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا
شکست وفتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ | مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

یہ وہی میرؔ ہے جو کہتا ہے:- "رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا"

برسوں لگی تھیں آنکھیں دروازۂ حرم سے | پردہ اُٹھا تو لڑیاں آنکھیں ہماری ہم سے
مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں | تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں
موت اک ماندگی کا وقفہ ہے | یعنی آگے چلیں گے دم لیکر

اور اس شعر میں تو شاعر غم وخوشی کی سرحدوں سے آگے نکل گیا ہے:-

رنگِ گُل وبوئے گُل ہوتے ہیں ہوا دونوں | کیا قافلہ جاتا ہے تو بھی جو چلا چاہے

ذرا دنیا کی عاشقانہ شاعری میں اس شعر کا ہم پلہ شعر تو ڈھونڈھ نکالئے:-

جفائیں دیکھ لیاں، کج ادائیاں دیکھیں | بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

دیکھئے صرف لہجے کی تبدیلی سے ایک ہی احساس، ایک ہی واقعہ اور ایک ہی مضمون قنوطیت اور رجائیت دونوں کا حامل ہو جاتا ہے۔ غالب نے کہا ہے:-

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید | ناامیدی اسکی دیکھا چاہئے

اب دیکھئے آتش اسی ناکامی کا کس تیور سے مقابلہ کرتا ہے :-

موت مانگو تو رہے آرزوئے خواب مجھے — ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

غالب :- قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

آتش :- متصل نالوں کی آواز چلی آتی ہے — جسمِ خاکی قفسِ مرغِ گرفتار نہو

میر :- ہوگا کسی دیوار کے سایہ کے تلے میر — کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

آتش :- دھوپ میں سایۂ دیوار نے سونے نہ دیا — خاک پر سنگِ درِ یار نے سونے نہ دیا

حفیظ جونپوری- بیٹھ جاتے ہیں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے — ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

آتش :- سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے — ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

خالص غم کا احساس بھی آتش جب بیان کرتا ہے تو جوشِ حیات سے تڑپ کر :-

نہ پوچھ حال مرا چوبِ خشکِ صحرا ہوں — لگا کے آگ مجھے قافلہ روانہ ہوا

خوشی سے اپنی رسوائی گوارا ہو نہیں سکتی — گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ آتا ہے

اصغر کے یہ اشعار سنئے :-

غزل کیا اک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغر — یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

لیکن دل ہے اور شاعر کا دل ہے - درد سے بھر نہ آئے کیوں - یہ بھی کہہ دیا :-

جینے کا مزا پوچھو محرومِ تمنا سے — بیٹھا ہوا دنیا میں اُٹھ جائے جو دنیا سے

اک قطرۂ شبنم پر خورشید ہے عکس آرا — یہ ہستی و ہستی افسانہ سے ہے افسانہ

سنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی — کچھ اصل ہے کچھ وہم ہے کچھ طرزِ بیاں ہے

فانی بدایونی نے قنوطیت کے رنگ کو دیکھئے کیسا چمکایا ہے

آتی رہے گی خیر اب اس زندگی کو موت — یہ تو ہوا کہ موت مری زندگی ہوئی

نہیں ضرور کہ مر جائیں جاں نثار ترے — یہی بہت ہے کہ جینا حرام ہو جائے

دیکھا نہ آنکھ اُٹھا کے کبھی اہلِ درد نے — دنیا گزر گئی غمِ دنیا لئے ہوئے

ڈوبنے والوں کو پلٹے کئی موجوں نے دئے — رخ مگر جانبِ ساحل نہیں ہونے پاتے

موتِ ہستی پہ وہ تہمت کہ مٹائے نہ مٹی — زندگی مجھ پہ وہ الزام کہ مشکل سے اُٹھا

یاس یگانہ کو سنئے :-

زمیں پہ خاک کے پتلوں نے کیوں دھنی دی ہے — کفن ملے تو سمجھنا دھنی تھے قسمت کے

نئی زمین، نیا آسماں، نئی دنیا　　عجیب شے یہ طلسم خیال ہوتا ہے

یاس کا یہ فارسی شعر بھی سنئے:-

زندہ در گوریم و شاید زندۂ جاوید ہم　　جرعۂ خوردیم یاس از آب حیوانے دگر

عبرت گورکھپوری کہتے ہیں:-

کیا ڈھونڈھتی ہو باغ میں میرے، تو لئے خزاں　　تو جانتی ہے سب کے چمن میں بہار ہے

مگر شاعر باوجود اس دلتنگیٔ حیات کے لامتناہی سلسلے تک بھی رسائی رکھتا ہے۔ رواں کہتے ہیں:-

جنبشِ برگ شجر سے تا بہ طوفانِ حیات　　ایک ہی پیغامبر تھا ایک ہی پیغام تھا

مانی جائسی کا یہ شعر سنئے:-

تجسس ہو تو ملجاتا ہے سب کچھ دارِ امکاں میں　　کوئی لمحہ خوشی کا آ و ڈھونڈھیں عمر انساں میں

لیکن اقبال خوشی اور غم کے دوراہے سے آگے نکل گیا ہے، اُسے کسی اور چیز کی تلاش ہے۔ کہتا ہے:-

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں　　کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

اس تلاش میں سورج اور چاند بھی اس کے سامنے گرد راہ ہو کر رہ جاتے ہیں:-

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا　　مہر و ماہ و مشتری کو ہمعناں سمجھا تھا میں

اب آپ نے شاید یہ اندازہ کر لیا ہو گا کہ اردو غزل گوئی محض لکیر کی فقیر نہیں ہے حیات اور کائنات پر کتنے مختلف انداز اور قریب اور دور کتنے مقامات سے حقیقت کی چھوٹ پڑ رہی ہے۔ قنوطیت اور رجائیت کی روحانی، فلسفیانہ اور طبعی ترجمانی کس کس انداز سے ہمارے شعرا نے کی ہے۔ قنوطیت اور رجائیت کی وہ شکل جس میں ٹھہراؤ ہے اور وہ شکل جو (Dynamic) ہے اور ان دونوں کے میل سے (Meliorism) کے جس فلسفہ کا ذکر آچکا ہے اس کی بھی داد ہمارے غزل گو شعرا نے دی ہے ان کا رونا ہنسنا، ان کی غم اور خوشی ہر جگہ برائے بیت نہیں ہے۔ ہم اردو غزل گوئی کے سماجی پس منظر کا ذکر کر چکے ہیں۔ اس لئے اردو شاعری میں دور اقبال سے قبل ڈھونڈھنے سے سب کچھ تو ملتا ہے لیکن قنوطیت اور رجائیت کو سمو کر کوئی ایسا زبردست سوشل یا آفاقی فلسفہ اردو غزل میں رونما نہیں ہوا تھا جس میں اجتماعی حیات کے ارتقا کا ڈراما پیش کیا جائے زیادہ تر ہماری غزل گوئی انفرادی یا (Egotistic) اور (Self Centered) رہی ہے۔ لیکن اگر اب تک یہ کمی اردو غزل میں رہی ہے تو اقبال نے محض اپنی نظموں میں نہیں، بلکہ غزلوں میں قنوطیت اور رجائیت کو فلسفۂ تاریخ سے ہم آہنگ اور آفاقی وسعتوں سے آشنا کرا دیا ہے تنگنائے غزل کو اپنے اندر نئی وسعتوں کا احساس ہو رہا ہے۔

قنوطیت اور رجائیت محض دنیاوی غم اور خوشی، مادی کامیابی اور ناکامی تک محدود نہیں۔ ٹریجڈی ہیرو

یا کرداروں کی موت نہیں ہے۔ رومیو اور جولیٹ کی ٹریجڈی حقیقت میں نشاطِ شباب کا اظہار ہے۔ جب انفرادی اور قومی زندگی دنیا کو بہت کچھ دیکھ لیتی ہے تب حقیقی شاعری رونما ہوتی ہے۔

قنوطیت اور رجائیت باہم متضاد اور متصادم فلسفے نہیں ہیں۔ شاعری کا رجحان لامحدود کی طرف رہتا ہے۔ اور لامحدود کا محض غمناک تصور ناممکن ہے۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

رہ گئے وہ لوگ جو محض ہنسی کھیل کو رجائیت اور رونے دھونے کو قنوطیت سمجھے ہوئے ہیں۔ تو رونے دھونے والے حضرات کے لئے کافی غم انگیز افسانے موجود ہیں اور ہنسی کھیل والوں کو دیوان رنگین دیوان جانصاحب زیادہ حیات بخش ثابت ہوں گے۔ رہی سنجیدہ اُردو غزل گوئی تو اسکے لئے صرف یہ کہوں گا کہ:۔

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں

اور قبل اس کے کہ آپ پیش دستی کریں میں عروسِ شاعری کو لیکر آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔

(۲)

اظہارِ شخصیت

اُنیسویں صدی کے آخری پچیس سال میں انگلستان کے اخباروں اور رسالوں میں کسی تحریر کے اخیر میں تین حروف جادو کا کام کرتے تھے وہ تین حروف تھے (R. L. S.) یعنی (Robert Louis Stevenson) کے ان میں ایسی دلکش اور دلفریب شخصیت کی جھلک پائی جاتی تھی کہ ان پر نظر پڑتے ہی شوق دلوں میں چٹکیاں لینے لگتا تھا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب چوٹی کے ادیب انگلستان میں موجود تھے۔ کارلائل۔ رسکن۔ میکالے۔ ٹینسن۔ براؤننگ، لیکن اسٹیونسن کو "Prince darling of literature" کہا گیا۔

بیسویں صدی کے انگریزی ادب میں کچھ ایسا ہی اثر G.B.S. یعنی George Bernard Shaw اور G. K. C. یعنی Gilbert Keith Chestorton کے دستخطوں میں تھا یونو شا اور چسٹرٹن کے ہم مرتبہ معاصرین میں اور نام بھی ہیں لیکن ان کی تحریروں اور تصنیفوں میں جو کچھ بھی عظمت اور درخشندگی ہو لیکن اُن کے دستخطوں میں وہ جادو نہیں۔

ادب میں اظہارِ شخصیت کے متعلق کہا گیا ہے کہ مخاطب کا گریبان پکڑ کر (دست و گریباں ہو کر نہیں) گفتگو کرنے کا انداز (the button holing manner) اور مخاطب کو ہمراز یا ہم آہنگ

بنانے کا انداز (the confidential manner) اس کی خصوصیت ہے۔ مخاطب کو اپنا جان کر اس سے بے تکلف بالکل فطری انداز میں بات چیت کرنا یہی لٹریچر میں اظہار شخصیت ہے لیکن انگریزی ادب میں یہ صفت نثر کے چند انشا پردازوں میں بہت لطیف شکل میں ملتی ہے اور انگریزی شعرا میں شاید چاسر (Chaucer) کو چھوڑ کر یہ صفت کسی اور کے کلام میں نظر نہیں آتی۔ اس پر تعجب ہو سکتا ہے مگر ہونا نہیں چاہیے۔ شاعری انتہائی فطری چیز ہوتے ہوئے بھی غیر معمولی شدت احساس اور غیر معمولی کیفیت کا اظہار کرتی ہے۔ بات چیت جذبات کی اس شدت کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ انگریزی میں شعر کی زبان اپنی روایتوں کی بنا پر ضرورت سے زیادہ پر تکلف اور سنجیدہ بلکہ خطیبانہ رہی ہے۔ انگریزی نثر پر یہ اصول کہ "اسلوب آدمی ہے" (The style is the man) صادق آتا ہے لیکن انگریزی شاعری پر ان معنوں میں صادق نہیں آتا۔ میں انگریزی پڑھاتا ہوں۔ امتحان میں انگریزی نثر نگاروں کی اسٹائل یا اسلوب پر ضرور سوال ہوتے ہیں لیکن کسی شاعر کی اسٹائل پر سوال نہیں پوچھے جاتے اس کا یہ مطلب نہیں کہ انگریزی شاعری میں مختلف اسلوب بیان نہیں ہوتے۔ لیکن شاعر کی فطری بول چال کی آواز، اور اس کی وہ طرز گفتگو جب وہ شاعری نہیں کرتا اس کے کلام میں نہیں پائی جاتیں۔

اس کے برعکس اُردو غزل کی روایاتی زبان میں فطری بول چال، مانوس لب و لہجہ، محاوروں اور ٹکسالی بولی کو جو اہمیت حاصل ہے اس کی مثال فارسی شاعری میں بھی نہیں ملے گی۔ اُردو کے معنے ہی بازار کے ہیں وہ بازار جو پہلے شاہی لشکر سے متعلق تھا۔ میرے شہر گورکھپور کے خاص بازار کا نام ہی اُردو بازار ہے۔ ہر چند ایک اثر اس کا یہ ضرور ہوا کہ ہماری شاعری کی سطح بلند نہ ہو سکی اور اکثر شاعری کا لہجہ سوقیانہ، عامیانہ اور بازاری ہو گیا۔ جیسے قلق کا یہ شعر:۔

رات کا وقت ہے، رہ جاؤ، کہاں جاؤ گے — یہ شب تار، یہ برسات، یہ کیچڑ پانی

(ذوق نے تو پوری پوری مثلیں اور کہاوتیں اپنی غزلوں میں کھپا دیں) مگر ذوقِ سلیم کے یہ معنے نہیں کہ بول چال کی نرمی اور روزمرہ کی چاشنی کو بلند شاعری کے منافی سمجھ لیا جائے۔ اثر دہلوی کا یہ شعر سنئے:۔

کیا سے کیا کر دیا محبت نے — اب جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں

اگر آپ روزمرہ میں عشقیہ احساس کے بجائے غزل میں جوش عمل چاہتے ہیں، تو اصغر کا یہ شعر سنئے:۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے — اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

بہرحال بے تکلف بول چال اور مانوس لب و لہجہ اُردو غزل کی وہ خصوصیت رہی ہے جو اُسے فارسی شاعری سے بھی الگ کرتی ہے۔ یہ صفت اظہار شخصیت کے بہت امکانات اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ بول چال کی زبان شدتِ شعریت (Poetic Intensity) اور احترازِ شعریت (Poetic aloofness) کو نرم کر دیتی ہے

اور شعر کی زبان کو نثر کی مانوس زبان کے قریب تر کردیتی ہے۔ لیکن محض بول چال کی زبان اظہار شخصیت کے لئے کافی نہیں ورنہ اُردو کے ہر غزل گو کے یہاں اظہار شخصیت کی مثالیں مل جائیں کیونکہ قریب قریب ہر صاحب دیوان نے بہت سے شعر زبان میں کہے ہیں۔ اظہار شخصیت کے لئے سب سے ضروری چیز شخصیت ہے۔ یوں تو ہر چیز کی ایک انفرادی حیثیت ہوتی ہے، ہر چیز میں ایک نرالا پن پایا جاتا ہے۔ ہمارے کالج میں فلسفہ کے معلم پروفیسر ریڈ فورڈ کہا کرتے تھے کہ دو چیزوں میں مشابہت بتانے کا مطلب یہی ہے کہ ان میں فرق ہے۔ مشابہت یا یکسانیت کے معنے یہ نہیں کہ ایک چیز بالکل دوسری چیز سمجھ لی جائے۔ دو برگ گیاہ، کسی درخت کی دو پتیاں بالکل ایک طرح کی نہیں ہوتیں۔ دنیا میں ہر شے یکتا ہے۔ یوں تو ہر فرد کی ایک شخصیت ہوتی ہے لیکن بادی النظر میں اس کے خط و خال اس کے نقوش مٹے مٹے سے رہتے ہیں اور زندگی یا ادب میں ہر شخص اپنی شخصیت کو نمایاں بھی نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے بہت بڑے فن کار کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے کیا کہا؟ بہت بڑے فن کار، بہت بڑے شعرا بھی اسے نہیں کر سکتے۔ ان کا آرٹ غیر شخصی (Impersonal) ہوتا ہے۔ مثلاً انگریزی شاعر ملٹن کسی نثر یا نظم میں اپنی معمولی اور مانوس شخصیت کا اظہار نہیں کرتا۔ ڈاکٹر جانسن کی شخصیت کے مظاہرے اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کی تصنیفیں نہ پڑھیے، اس کے حالات اور اس کی گفتگو جس طرح اس کے سوانح نگار باسول نے قلمبند کیا ہے اُنھیں پڑھئے۔ اُردو غزل گو شعرا میں ناسخ سے ایک مصرعے میں بھی اظہار شخصیت نہ ہوسکا لیکن ناسخ کے جو حالات اور جو لطایف و ظرایف آب حیات میں درج ہیں ان سے البتہ ناسخ کی شخصیت کا پتہ چل جاتا ہے۔ ہندوستان کی مردم شماری کی رپورٹ میں پڑھے لکھے آدمی کی یہ تعریف کیگئی ہے کہ جو شخص خط لکھ سکے یا خط پڑھ سکے وہ لکھا پڑھا آدمی ہے۔ اس طرح جہاں تک تعلیم یافتہ ہونے کا تعلق ہے خط و کتابت کا درجہ سب سے کم ٹھہرا لیکن سو برس سے دن رات لاکھوں خط ہندوستان کی زبان میں لکھے جا رہے ہیں پھر بھی غالب کے وہ تھوڑے سے خطوط جن کے بارے میں وہ بجا طور پر دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ایسے خطوط بڑے بڑے شعرا اور ادیب نہ لکھ سکے۔ کوئی نثر اظہار شخصیت کے لحاظ سے غالب کے خطوط کے مقابلہ میں کم از کم میرے ذہن میں تو آتی نہیں۔ اسی طرح روزنامچہ (DIARY) لکھنا بہت آسان معلوم ہوتا ہے۔ پولیس کے ہر دفتر میں روزنامچوں کے پہاڑ کے پہاڑ نظر آجائیں گے۔ مگر پہاڑ کی طرح جمود اور بے حسی بھی ان میں ہوگی۔ انگریزی میں سیمول پیپس (Samuel Pepys) کا روزنامچہ اظہار شخصیت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ شعر و ادب میں ہم آہنگی اور یکجہتی کا لب و لہجہ پیدا کرنے کے لئے فطری طرز گفتگو ضروری ہے لیکن اظہار شخصیت کے لئے کافی نہیں۔ یوں تو اُردو غزل میں ہر صاحب طرز اپنی طبیعت اور اپنا مزاج نمایاں کر دیتا ہے لیکن یہ اس کی غیر معمولی، جمالیاتی یا وجدانی شخصیت ہوتی ہے، جو حیثیت شاعر کے اس نے پیش کی ہے، بات یہ ہے کہ آدمی ہو یا شاعر، پیغمبر ہو یا اوتار شخصیت کا اظہار چھوٹی چھوٹی باتوں، معمولی واقعات، معمولی حرکات و سکنات

سے ہوتا ہے۔ غیر معمولی حالتوں یا کیفیتوں میں شخصیت کا اظہار نہیں ہوتا۔ سوز و ساز کے عالم سے اظہار شخصیت الگ ہے۔ کہا گیا ہے کہ المیہ کا تعلق تنہائی سے اور طربیہ سماجی چیز ہے اس لئے کسی ادیب میں اپنی شخصیت کے متعارف کرانے کے لئے ٹریجڈی کے بجائے کومیڈی کی اسپرٹ کا ہونا ضروری ہے خواہ کومیڈی کی یہ اسپرٹ تلخی اور تیکھاپن ہی اپنے اندر کیوں نہ رکھتی ہو۔ شاعری اور شاعرانہ جذبات کو اظہار شخصیت کے لئے واقعیت کی ضرورت ہے۔ واقعیت ہی شاعری کے برقی ارتعاشات میں وہ توازن اور ٹھہراؤ پیدا کر سکتی ہے جو اظہار شخصیت کے لئے لازمی ہے۔ مگر اسکے لئے ضروری ہے کہ شاعر اپنی شعریت اور وجدانیت کی زد سے بھی ذرا بچا ہوا رہے۔ صرف شاعرانہ بے لاگی اور بے لوثی کافی نہیں بلکہ نقادانہ بے لاگی اور بے لوثی کی بھی ضرورت ہے۔ اظہار شخصیت کے لئے شاعری کی اسپرٹ کو نثر کی اسپرٹ اور اس کے لطایف اور ظرایف سے ہم آہنگ ہونے کی بھی ضرورت ہے۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ اظہار شخصیت کیلئے یہ ضروری نہیں کہ شاعر اپنا حال بیان کرے۔ بلکہ ضروری یہ ہے کہ ایسے اشعار میں ہم شاعر کے دیدہ و دل سے زندگی کا مشاہدہ اور تجربہ کریں۔

اُردو کے مشہور غزلگو شعرا میں یہ قابل رشک صفت سب کے حصے میں نہیں آئی۔ میر کے یہاں صرف چند ایسے اشعار ہیں جن پر اظہار شخصیت کا گمان ہوتا ہے، سودا کی غزلوں میں اس طرح کا ایک شعر بھی میرے ذہن میں نہیں آتا لیکن قصیدوں میں اور ہجووں میں تو اس نے وہ اظہار شخصیت کیا ہے کہ الامان۔ اگلے دور میں غالب کو اظہار شخصیت کرنا آیا لیکن ذوق، مومن، شیفتہ اور ظفر کو نہ آیا، حالی کبھی کبھی اپنی شخصیت ظاہر کر جاتا ہے۔ شعرائے لکھنؤ میں انشا اور جرأت کی شخصیت دلوں میں چٹکیاں لیتی ہے مگر مصحفی سے یہ رنگ نہ نبھا۔ آتش کی شخصیت اسکے کلام میں شرر باریاں کر رہی ہے، ناسخ محض پہلوان سخن ہونے کی داد دے رہے ہیں۔ امیر مینائی ریش اور عمامہ کے ہو کر رہ گئے لیکن داغ کی شوخ و شنگ شخصیت بے پناہ چیز ہے۔ امیر تو مولوی آدمی ٹھہرے لیکن ریاض خیرآبادی اور مضطر خیرآبادی کا کلام ان کی شاعری سے زیادہ ان کی انفرادی شخصیت کو نمایاں کرتا ہے۔ دور حاضر میں چوٹی کے غزل گو حسرت، اصغر، فانی، یاس یگانہ، جگر، ڈاکٹر اقبال، عزیز، صفی، محشر اور کچھ اور لوگ کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن شخصیت کی جھلک غالباً یاس یگانہ اور جگر مرادآبادی کے سوا اور کہیں نہیں پائی جاتی۔ اکبر الٰہ آبادی غزلوں میں نہیں بلکہ متفرق اشعار، قطعات، رباعیوں اور نظموں میں اپنی شخصیت کا اظہار کرتا ہے اور ایسا کہ شاید و باید۔

مثالیں ہم میر سے شروع کرتے ہیں۔ آیئے عالم سوز و ساز سے ہٹ کر بدرستی ہوش و حواس میر کا مطالعہ کیجئے۔ کہتا ہے:۔

دنیا کی سیر میر کی صحبت میں ہو گئی　　قسمت سے ہم کو آج یہ بیدست و پا ملا

شکوۂ آبلہ ابھی سے میر　　ہے پیارے ہنوز دلی دور

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے　　سب اُسی زلف کے اسیر ہوئے

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ مذہب عشق اختیار کیا،
میرؔ صاحب زمانہ نازک ہے دونوں ہاتھوں سے تھامئے دستار
پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی،
تم جو چاہو سو کہو میرؔ کو، جاہیں، ہیں تمھیں، اور ہم لوگ تو سب ان کا ادب کرتے ہیں،

بس اس سے زیادہ نیچے میرؔ نہیں اُتر سکتا اور اس سے زیادہ بے تکلفی اور یگانگی یا مانوسیت کی اُمید میرؔ سے تو نہ رکھئے۔
انشاؔ اور جرأتؔ کے دیوان اس وقت میرے سامنے نہیں نہ قلم برداشتہ ان کے زیادہ اشعار یاد آئے۔ لیکن غالبًا یہ دو چار شعر کافی ہوں گے؟

جھڑکی سہی، ادا سہی، چینِ جبیں سہی، یہ سب سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی
گر نازنیں کہے سے برا مانتے ہیں آپ میری طرف تو دیکھئے میں نازنیں سہی } انشاءؔ

جب یہ سنتے ہیں وہ ہمسایہ میں ہیں آئے ہوئے کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے
سرسری اُن سے ملاقات ہے گاہے گاہے صحبتِ غیر میں گاہے سرِ راہ گاہے } جرأتؔ

لیکن اس رنگ کا بادشاہ جس میں اُردو کا کوئی شاعر اور غالبًا دنیا کے بہت کم شاعر اس کے شریک ہیں غالبؔ ہی ہے۔ میں نے بارہا اس امر پر غور کیا کہ غالبؔ کی ہمہ گیر مقبولیت اور اس کے شاعرانہ فتوحات کا راز کیا ہے تو مجھے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ شعر اور نثر کے جوہروں کا جیسا امتزاج غالبؔ کے اشعار میں ہوا ہے ویسا کسی اور کے یہاں نہیں۔ اس کی بیقرار حساسی میں طنز و تنقید اس طرح سموئے ہوئے ہیں، ٹریجیڈی اور کومیڈی کا وہ متوازن اتحاد اس کے کلام میں ہے جو کہیں اور نہیں ملتا۔ حضرت نیاز فتحپوری نے غالبؔ کے کلام کا یہ چور پکڑ لیا تھا اور لکھا تھا کہ غالبؔ کے یہاں استیصالِ جذبات (Emotional passivity or lyric abondon) نہیں ہے۔ لیکن دنیا میرؔ کی خستگی اور استخواں سوز و جانگداز شاعری کی متحمل کبھی کبھی ہو سکتی ہے اور غالبؔ کے اشعار ہر وقت اس لئے مزہ دیتے ہیں کہ کاروباری دنیا اور شاعرانہ دنیا کی سرحدیں یہاں مل جاتی ہیں۔ اسی نقادانہ توازن، اسی واقعیت نے غالبؔ کو غالبؔ بنا دیا۔ غالبؔ گم شدگی کے عالم میں بھی اپنا وقوف نہیں کھوتا۔ آپ نے غالبؔ کی تصویر دیکھ کر کبھی یہ محسوس کیا کہ اس کے لبوں کے ملنے سے جو باریک خط اور گوشے بنتے ہیں اس میں کتنی پُرکاری، کتنی شوخی پائی جاتی ہے۔ یہ بات بھی کم حیرت انگیز نہیں کہ مشکل گو ہونے کی شہرت پا کر بھی، رنگِ بیدلؔ کی تقلید کے باوجود بھی اتنا فطری طرز ادا اور اسقدر بے تکلف زبان میں شعر کہنا اوروں سے تو کیا داغؔ دہلوی سے بھی ممکن نہ ہوا۔ سچ کہا ہے:-

لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھٹھول سو تکلف اور اسکی سیدھی بات

صرف چند اشعار سنئے:-

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے — کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

قیامت ہے کہ ہوئے مدعی کا ہمسفر غالب — وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے — دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم — بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام — ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

ہاں اہل طلب کون سنے طعنۂ نایافت — جب پا نہ سکے اسکو تو آپ اپنے کو کھو آئے

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی — پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں — رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں — میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں

گو ہاتھوں میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ابن مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی،

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو — جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ — کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

آپ نے دیکھا کہ غالب کے جن اشعار میں اظہار شخصیت پایا جاتا ہے ان میں ایک خاص قسم کی تازگی اور فطری انداز بیان کے ساتھ ساتھ ایک نہایت دلکش انوکھاپن یا اچھوتاپن بھی پایا جاتا ہے۔ آیئے اب آتش کے یہاں اظہار شخصیت کی کچھ مثالیں دیکھیں۔ آتش کی شخصیت میں وہ گرماگرمی، وہ اکڑ، وہ جوش اور وہ تیور ہے جسکی مثال دنیا کے لٹریچر میں نہیں ملتی۔ رودکی سے لیکر آج تک فارسی کے کسی شاعر نے اس شخصیت کا ثبوت دیا ہے جسکا ثبوت آتش نے دیا ہے۔ آتش کے یہاں نہ محض سوزِ نہاں میں پگھلنا ہے نہ اس کے یہاں نقادانہ محاسبہ ہے۔ نہ محض گم شدگی نہ پُرکار خود شناسی بلکہ ایک کیف شباب، ایک جوش حیات ہے جس میں ادراک، عرفاں، جذبات اور عملی سرگرمی سب ایک ہو کر سنجیدگی اور بانکپن کا عدیم المثال امتزاج بن گئے ہیں۔ دریا ہے کہ جوش مار رہا ہے۔ فقر و فنا، ترک و غنا کو آتش نے رنگین اور نشاط انگیز بنا دیا اور دنیاوی زندگی کی چہل پہل اور گہما گہمی بے نیازی کی زندگی میں بھر دینا، یہ تنہا خصوصیت آتش کی شخصیت میں ہمیں ملتی ہے۔ انگریزی شاعر براؤننگ (Browning) جوش و خروش میں تو آتش سے کچھ ملتا جلتا ہے لیکن وہ اٹھلاتا ہوا شباب اور وہ پختہ کار بے نیازی براؤننگ کو نصیب

نہیں - چند شعر سنئے :-

راہ میں تیری شب و روز بسر کرتا ہوں
وہی میل اور وہی سنگ نشاں ہو کر جو تھا

بس زمانے کی دورنگی کو یہی کافی ہے
مئے گلرنگ سے لبریز رہیں جام سفید

طبل و علم ہی پاس ہو اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا

اے فلک کچھ تو اثر حُسن عمل میں ہوتا
شیشہ اک رات تو قاضی کی بغل میں ہوتا

رات بھر کیں دلِ بیتاب نے باتیں مجھسے
رنج و محنت کے گرفتار نے سونے نہ دیا

چمن کی سیر پر ہوتے ہیں جھگڑے
کمر میری ہے دستِ باغباں ہے

مشتاقِ دردِ عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے
کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ

تنگ کرتی ہے قبا تجھکو نہایت اے گل
بند بند اس کے کرے گا یہ گنہگار جدا

نعمت فقر ہے موجود جسے رغبت ہو
آب شیریں ہیں ہو نانِ نمکیں تھوڑی سی

کون سا گل نہیں گلزار جہاں میں مغرور
کس کے چہرے میں نہیں چینِ جبیں تھوڑی سی

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روزِ محشر تک
نہ اک مو کم ہوا اپنا نہ اک تار کفن بگڑا ''

داغ اور ریاض کو کچھ لوگ ہم پلّہ اور حریف سمجھتے رہے ہیں۔ بادی النظر میں دونوں کی شخصیت یکساں شوخ اور چنچل معلوم ہوتی ہے۔ دونوں آفت کے پرکالے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن دونوں میں بڑا فرق نظر آئے گا۔ داغ کی شوخی میں اصلیت اور واقعیت ہے ریاض کی شوخی زبان و بیان کی شوخی ہے۔ داغ اور ریاض کے چند اشعار سنئے :-

داغ :-

عشق میں رنج وہ پائے ہیں کہ جی جانتا ہے
لطف بھی ایسے اُٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے

آج تو داغ کو ہم لوگ گلی سے اُس کی
اس طرح کھینچ کے لائے ہیں کہ جی جانتا ہے

لگ گئی چپ تجھے اے داغ کہاں کی ایسی
مجھ کو کچھ حال تو کمبخت سناتا اپنا،

جب سے چھوڑی ہے محبت نظر آتے ہیں یہ خواب
کھینچتا ہے کوئی دامن تو گریباں کوئی

کر دیا صاف الگ دل نے ہمیں الفت میں
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں بیگانے سے

ریاض :-

اس طرح کہ گھنگرو کوئی چھاگل کا نہ بولے
وہ چھم سے چلیں جب کوئی چپکے سے اُٹھالے

ہم آگئے ہم پا گئے ہم لے گئے ان کو
وہ کھوئے گئے کوچۂ دشمن سے نکل کر

کوئی منہ چوم لے گا اس نہیں پر
شکن رہ جائے گی یونہی جبیں پر

ہے ابھی میرے بڑھاپے میں جوانی کیسی
ہے ابھی ان کی جوانی میں لڑکپن کیسا

بعد اک عمر کے میخانے میں آئے ہیں ریاض　　آپ بیٹھے ہیں بچائے ہوئے دامن کیسا

رہے مضطر خیرآبادی سو ان کی شخصیت مجھے انشاؔ کی شخصیت کا عکس معلوم ہوتی ہے۔ انھیں کچھ لوگ مضطرِ پیا کہتے تھے۔ یہ نام ان کے اظہارِ شخصیت پر بری تنقید نہیں ہے۔

یاس یگانہ اور جگر مرادآبادی کے بھی ایک ایک دو دو شعر سُن لیجئے:۔

یاس یگانہ۔　جو آ گیا ہے تو بس ایک رات بستا جا　　گرجنے والے گرجتا ہے کیا برستا جا
تو آپ اپنی ہی شمشیر آپ اپنی سپر　　یگانہ باگ اُٹھا اپنے بل پہ کستا جا

جگر کی شخصیت ان کی زندگی ہی میں ایک افسانہ بن گئی ہے۔ اُن کا کوئی شعر کیا سناؤں۔ ان کی وہ غزل "توبہ کو توڑ تاڑ کے تھرّا کے پی گیا" ان کی شخصیت کی پوری جھلک لئے ہوئے ہے۔ پھر بھی میرے خیال میں جگر کی شاعری تخئیلی اور جذباتی زیادہ ہے اور ان کی وجدانی وجمالیاتی شخصیت بہ نسبت ان کی فطری شخصیت کے زیادہ نمایاں ہے۔

اختتام پر یہ گزارش کر دینا چاہتا ہوں کہ اظہارِ شخصیت والی شاعری باوجود اپنی نرالی دلفریبیوں کے بہت بلند قسم کی حقیقی شاعری نہیں ہے کیونکہ یہ وضع، انداز، طور اور آن کی شاعری ہے۔ بڑا شاعر اپنے کلام میں اظہارِ شخصیت کر سکتا ہے لیکن سب سے بڑے شعرا ہومر، شکسپیر، فردوسی، کالیداس اپنے وجدان اور اپنی شخصیت کو کائنات اور حقیقت میں تحلیل اور محو کر دیتے ہیں۔ ان کی شاعری خودبینی اور خودنمائی نہیں ہوتی بلکہ کائنات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ میتھو آرنلڈ کے قول کے مطابق بلند ترین شاعری کی خصوصیت ہے بے لاگ اور بے لوث واقعیت کا اظہار، کیٹس اپنے ایک خط میں لکھتا ہے کہ ایک شاعر کا وجود نہایت غیرشاعرانہ وجود ہے۔ سب سے بڑی شاعری عجائب وغرائب تک محدود نہیں رہتی۔ بلکہ اس پرانی دنیا اس جانی اور پہچانی ہوئی دنیا کے مانوس اور متعارف مناظر کو بے کم وکاست پیش کر دیتی ہے۔ اس کے وجدان میں اصلیت کا توازن ہوتا ہے اور اس کے آئینہ میں اصلیت کے خط وخال نہ کہ شاعر کے خط وخال۔ لیکن اظہارِ شخصیت نے ہماری شاعری میں جو گل کھلائے ہیں ان کے رنگ وبو کی دلکشی سے انکار ناممکن ہے۔

مذہب کی حقیقت

کا علم اگر آپ کو نہیں۔ اُسکے مراسم وشعائر سے اگر آپ ناواقف ہیں تو "فلسفۂ مذہب" کا مطالعہ کیجئے جو اس موضوع پر اپنے قسم کی پہلی کتاب ہے اور لفظ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ قیمت مع محصول ۱۲؍ رعایتی عہ ——— منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

کیوں صاحب، یہ کیا بات ہے کہ سوال عمر، زید، بکر کا آیا تو ——— "التفات کے دریا بہا دئے"
اور ——— چوں نوبتے باشد آتش بجام کردند
ساقی یہ تری کم نگہی یاد رہے گی!

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ کل سے اس وقت تک مارے غصہ کے سوائے "خونِ دل پینے اور خونِ جگر کھانے" کے اور کچھ نہیں کیا۔ میں جانتا ہوں آپ اسے لکھنوی شاعری سمجھ کر ہنس پڑیں گے اور اس طرح گویا میرے زخم پر اور "نمک پاشی" فرمائیں گے۔ لیکن آپ کی ان ٹھنڈی گرمیوں کا جواب یہی ہو سکتا ہے یا پھر یہ کہ محسن کاکوروی کا یہ شعر پڑھ دوں:۔

کہاں ہے آتش یاقوت لب میں وہ بھڑک باقی
کہ خطِ سبز نے چھینٹا دیا آب زمرد کا

لیکن آپ کیا خاک سمجھیں گے، آپ کو کیا سلیقہ ہے، کل پرنس مرزا باقر علی خاں صاحب کے پاس جاؤں گا اور اس رعایت لفظی کی داد اُن سے لونگا۔ سنا آپ نے۔ وہیں گانا سنونگا، اور کبوتر بازی کے متعلق تمام معلومات حاصل کر کے اس موضوع پر ایک مضمون آپ کے نام سے نگار میں شایع کر دونگا۔ آپ کانوں پر ہاتھ دھریں گے، واویلا مچائیں گے۔ میں کہونگا یہ جھوٹ بکتے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ یہی کام کیا ہے اور اب بھی اسی پر زندگی کا انحصار ہے۔ اگر موقع قسم کھانے کا آیا تو حلف بھی اُٹھالونگا۔ الغرض آپ کو پریشان کرنے کے لئے وہ سب کچھ کروں گا، جس کا آپ کو علم بھی نہیں ——— اور سنائیے!

جانِ نیاز ——— یہ کیا ظلم ہے جو مجھ پر ڈھایا جا رہا ہے۔ آپ باوجود مجبور ہونے کے اس قدر آزاد کہ جسوقت جو کچھ جی میں آیا کہدیا اور ہیں باوصف آزاد ہونے کے اتنا مجبور کہ آج جو تحریر آپ کی ملی ہے اس کا جواب اب سے ایک ماہ کے بعد نگار ہی کے ذریعہ سے دے سکتا ہوں۔ آپ ہی کا لکھا ہوا مصرعہ دہرانا پڑتا ہے کہ

چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنار ما بہ کنار ما

یہ "الٹی میٹم" آپ نے کس کو دیا ہے۔ انھیں کو نا ——— "جو نہیں جانتے وفا کیا ہے"۔ میں ڈر گیا کہ کہیں خطاب میری طرف تو نہیں ہے ——— یہ آپ کو لیکر کہاں جائیں؟ ——— ذرا وضاحت سے فرمائیے، میں سمجھا نہیں۔

آپ کی غزل کی داد کیا دے سکتا ہوں
نظر کو تاب تماشائے حسن یار کہاں؟

آپ کے یہ دو شعر کبھی نہیں بھول سکتا

امید تیرا بُرا ہو ڈبو دیا تو نے — دئیے ہیں آخری دم تک فریب ساحل کے

تمام رات تصور میں گفتگو اُن سے! — تمام رات فسانے تباہیِ دل کے ! !

جس وقت یہ تحریر آپ کی نگاہ سے گزریگی میں حیدرآباد میں ہونگا۔ اور غالباً آخر مارچ تک وہیں رہوں گا۔ اگر آپ اس دوران میں اپنا ترکش کچھ اور خالی کرنا چاہیں تو "امپیریل پوسٹ آفس" کے ذریعہ سے

بر دست و پائے بند گرانے نہادہ

نازم بہ بندگی کہ نشانے نہادہ

مکرمی - تسلیم - غالب کی فارسی شاعری کے متعلق آپ میری رائے مجھ سے صرف ایک جملہ میں چاہتے ہیں۔ اچھا تو سنئے، لیکن غالب ہی کی زبان میں، کہتا ہے:-

نظمِ غالب نگر کہ پنداری

کز کمیں گاہ جستہ خیلِ غزال

اسوقت تک غالب کی شاعری کے متعلق دفتر کے دفتر لکھے جا چکے ہیں لیکن خدارا بتائیے کیا اس سے بہتر رائے آپ کی نگاہ سے کبھی گزری ہے اور وہ بھی اتنے مختصر الفاظ میں! — آپ اس کا حقیقی رنگ سخن دیکھئے، الفاظ کے تیکھے پن پر نگاہ ڈالئے، بیان کی شوخی و بیباکی کو سامنے رکھئے، طرزِ ادا کی صفائی و شستگی پر غور کیجئے اور پھر اس بیان پر کہ

"کز کمیں گاہ جستہ خیلِ غزال"

کیا آپ اسے غالب کی شوخ نگاری کا معجزہ نہ کہیں گے؟

میرے نزدیک غالب نے اپنی عمر میں دو غلطیاں کیں ایک بہت بڑی اور ایک بہت چھوٹی۔ بڑی یہ کہ اسنے ریختہ میں شاعری کی اور چھوٹی یہ کہ اس نے فارسی میں غزلیں بھی کہیں۔ اگر آج اس کا اُردو دیوان جسے وہ خود بھی "مجموعۂ بیرنگ" کہتا ہے موجود نہ ہوتا اور جو وقت تغزل فارسی میں صرف کیا ہے وہ مثنوی میں صرف کیا جاتا تو غالب کی حقیقی عظمت کا اندازہ کوئی کرتا یا نہ کرتا لیکن دنیا اس کا جواب نہ پیش کر سکتی

اس کے معنی یہ نہیں کہ میں اس کے دیوان ریختہ یا تغزل فارسی کا مداح و معترف نہیں ہوں بلکہ مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ فطرت نے اسے جس کام کے لئے پیدا کیا تھا اس کی طرف اس نے پوری توجہ نہیں کی

محبِ گرامی - ایک زمانہ کے بعد آپ نے یاد فرمایا۔ میں نے تو اس خیال سے مراسلت میں تقدیم نہیں کی کہ آپ مجھ سے خفا ہیں۔ اور آپ نے اس لئے پروا نہیں کی کہ میں کبھی آپ سے خفا ہو ہی نہیں سکتا، اور جو کبھی خفا ہو نا نہ جانے اسکو پوچھنا ہی کیا؟ اللہ، اللہ، کیا فرقِ مراتب ہے! —— جی ہاں، زندہ ہوں، لیکن شکر ادا کرنے کی حد تک نہیں۔

آپ پر رشک کرنا تو کوئی جرم نہیں بشرطیکہ آپ کو اس کا یقین بھی آجائے کہ رشک واقعی کوئی تکلیف دہ چیز ہے۔
یہ نہ آپ کی گزشتہ زندگی پر طعن ہے اور نہ میری موجودہ زندگی کی صحیح تصویر، بلکہ مقطع کی بات تھی اس لئے مجبوراً سخن گسترانہ انداز میں بیان کی گئی - آپ کچھ اور خیال نہ کیجئے گا۔
یقیناً میرے خیالات میں تغیر پیدا ہو گیا ہے اور بہت کافی - آپ ملامت انگیز انداز سے پوچھتے ہیں، یہ کیا ہے ؟
جواب میں سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

خوش رہئے، کیونکہ ایک زمانہ وہ آنے والا ہے جب یہ مجھے بُرا کہنے والے بھی تھک کر بیٹھ رہیں گے میرے لئے جینا اجیرن ہو جائیگا آپ کو معلوم نہیں "ملامتیا" طبقہ کا درویش ہوں اور میرے مدارج کی ترقی کا راز اسی میں پنہاں ہے کہ لوگ مجھے گالیاں دیں اور میں سن سنکر ہنسوں۔

بر کفے جامِ شریعت بر کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن

یہ شعر سعدی کا ہے - آپ سے کس نے کہہ دیا کہ غالب کا ہے۔

تلطف فرمائے بندہ - یاد آوری کا شکریہ قبول فرمایئے اور تاخیرِ جواب پر معذرت منفعل! گرامی نامہ پرسوں پہونچا اُصولاً و طبعاً مجھے اسی دن اظہارِ تشکر کرنا چاہئے تھا، لیکن اس دوران میں چند در چند مکروہات کا شکار رہا اور طبیعت کسی طرح حاضر نہ ہوئی کہ کوئی کام کی بات کرتا - آج بھی با دلِ ناخواستہ اس فرض کو ادا کر رہا ہوں -
ادبی انجمن کی تاسیس پر مبارکباد قبول فرمایئے اور بزمِ مشاعرہ برپا کرنے پر دعائے کامیابی - آپ مجھے یاد فرماتے ہیں، یہ آپ کی محبت ہے، لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ —— "آجکل آپ سے باہر ہے نظام" اور اسلئے اُسے محفل میں طلب کرنا خطرہ سے خالی نہیں -
اول تو یوں بھی معمولاً میں مشاعروں کی شرکت سے گریز کرتا ہوں، چہ جائیکہ اُسوقت جب طبیعت غیر حاضر ہو۔
غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

گرامی عزیز - آپ نے نہایت لطیف بحث چھیڑی ہے اور اتنی خوبصورتی کے ساتھ آپ نے استدلال کیا ہے کہ اس میں قطعاً کسی اضافہ کی گنجایش معلوم نہیں ہوتی۔
ایک ہی شعر میں مادیت سے گزرکر دفعتاً وجدان کی دنیا میں پہونچ جانا اچھے شعراء کے کلام میں بھی کمتر نظر آتا ہے، کیونکہ اکثر اس کو بالکل تصوف بنا کر رکھدیتے ہیں اور بہت کم ایسے ہیں جو تغزل کے حدود سے آگے نہیں بڑھتے غالب کے کلام

میں اس کی مثالیں اچھی اچھی ملتی ہیں۔ اس کا ایک مشہور شعر ہے:۔

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے
بہ جلوہ ریزی باد و بہ پرفشانی شمع

دوسرا مصرعہ بالکل مادیات سے تعلق رکھتا ہے، اور پہلا یکسر وجدانیات سے شاعر "جلوہ ریزی باد" اور "پرفشانی شمع" کو دیکھتا ہے، لیکن فوراً ہی حواسِ ظاہری کی دنیا سے گزر کر خیال و روح کے عالم میں پہونچ جاتا ہے اور اتنی خوبصورتی کے ساتھ کہ تغزل میں اور جان پڑ جاتی ہے۔ دوسری مثال ملاحظہ ہو:۔

ترے جواہر طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں،
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں،

"لعل و گہر" دیکھ کر جو مادی چیزیں ہیں، شاعر کا خیال فوراً اُن کے "اوجِ طالع" کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو بالکل جدانی چیز ہے اور غزل کی رنگینی بدستور قایم رہتی ہے۔ اسی خیال کو دوسرے زاویۂ نگاہ سے اس نے یوں ظاہر کیا ہے:۔

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

غالب کے اور چند شعر اسی رنگ کے سنئے:۔

وفاداری بہ شرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

اگر آپ اس التزام کے ساتھ تمام مشہور شعراء کے کلام کا انتخاب یکجا کر دیں تو بڑی خدمت ہو۔

استغفراللہ، کیا بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ جس چیز کو تم اتنا اہم سمجھتے ہو وہ اب کھیل سے زیادہ نہیں۔ بسم اللہ کے گنبد میں تم نے پرورش پائی ہے، تمھیں کیا خبر کہ "عقل و ہوش" کا معیار اب کیا ہے۔ سجدے کرتے کرتے، ناک رگڑتے رگڑتے ڈیڑھ ہزار برس کا طویل زمانہ گزر گیا لیکن اب تک تم نے خدا اور بُت کے فرق کو نہ سمجھا۔

برہمن گشتمے گر ایں قدر زنار می بستم

ایک طرف یہ بھی کہتے ہو کہ اسلام نے بُت پرستی کو مٹایا اور دوسری طرف اسی میں مبتلا بھی ہو، بُت، خواہ وہ خدا ہی کا کیوں نہ ہو، بُت ہے اور توڑے جانے کے قابل اور خدا، خواہ وہ کوئی بُت ہی کیوں نہ ہو، قابلِ پرستش ہے۔ مگر تم اس نازک فرق کو نہیں سمجھ سکتے۔ جاؤ، اُٹھو وضو کرکے نماز پڑھو، تمھارا بُت تم سے نخانہ ہو جائے۔ میں بھی جاتا ہوں، آئینہ سامنے رکھ کر اپنے خدا کو پوجوں گا۔

باب الاستفسار

درود شریف

(جناب نذیر احمد صاحب۔ سواسرا)

عرصہ سے سوچتا تھا کہ درود شریف کے متعلق آپ کے خیالات معلوم کردں آج آخر لکھنے بیٹھ ہی گیا۔ اسلام نے اس کو اتنی اہمیت کیوں دی حتیٰ کہ پانچوں وقت کی نماز میں اس کا پڑھنا لازمی قرار دیا۔ اور قرآن شریف میں بھی اس کی تاکید ہے میں خود بھی اس کا ورد رکھتا ہوں اور یہ واقعہ ہے کہ اس کے کثرت سے پڑھنے سے ایک عجیب قسم کا اطمینان قلب محسوس کرتا ہوں آپ اس کی کیا تاویل کریں گے؟ میں پرانا نمازی ہوں (لیکن تنگ خیال مُلّا نہیں) پچھلے دنوں نماز ترک کردی تھی آجکل پھر مذہبیت غالب ہے اور پانچوں وقت نماز پڑھتا ہوں۔ بہتر ہو اگر بذریعہ نگار مفصل جواب دیا جائے۔

(نگار) اس سے غالباً آپ کو انکار نہ ہوگا کہ درود شریف ہو یا اور کوئی دعا، ان سب کا تعلق عبادت سے ہے اسلئے سب سے پہلے مختصراً عبادت کی حقیقت کو سمجھ لیجئے۔

پرستش یا عبادت سے مراد ہی کسی ایسی ہستی کے سامنے اظہار عجز و طلب فلاح کرنا ہے جو انسانی ہستی سے بہت بلند واقع ہوئی ہے اور جس کا اصطلاحی نام خدا ہے۔ اس لئے عبادت کا تعلق محض جذبات انسانی سے ہے اور الفاظ و حرکات کو اس میں کوئی اہمیت حاصل نہ ہونا چاہئے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ خدا کا جو تصور عام طور پر مذاہب کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے وہ اتنا عجیب و غریب ہے کہ اسکے سامنے انسان اپنی انفرادیت و شخصیت، اپنی رائے و تمیز، اپنی آزادی و خودداری سب کچھ کھو بیٹھتا ہے اور اپنے تمام قوائے ذہنیہ معطل کرنے کے بعد ہی وہ محسوس کرسکتا ہے کہ اس نے "حقِ بندگی" ادا کیا، اس لئے ظاہر ہے کہ جب معاملہ خدا ایسی عجیب و غریب ہستی کو خوش کرنے اور خوش رکھنے کا ہو تو ایک "بندۂ خدا" کے جذبات نیایش و پرستش کی شدت کا کیا عالم ہوگا اور کس شدید تاثر کے ساتھ "حضوری" کا تصور اس پر مستولی ہونا چاہئے۔

پھر چونکہ ایک مذہبی انسان یہ بھی یقین رکھتا ہے کہ خدا اپنی تمام لازوال و غیر متناہی قوتوں کے ساتھ ساتھ ہر وقت "گوش بر آواز" بھی رہتا ہے اور "بصارتِ مطلق" ہونے کی بھی صفت کا حامل ہے، اس لئے وہ اس کی تعریف میں کچھ الفاظ بھی اپنی زبان سے ادا کرتا ہے (جس کا نام حمد و ثنا ہے) اور اپنے حرکات سے اپنے عجز و تذلل کو بھی ظاہر کرنا چاہتا ہے (جس کا نام رکوع و سجود وغیرہ ہے)۔

مذہب نے خدا اور بندہ کے درمیان اس تعلق کا تصور چونکہ اسی دنیا کے شاہ و گدا کو سامنے رکھ کر قایم کیا ہے اسلئے وہی تمام باتیں جو یہاں کی ایک خود مختار فرمانروا ہستی کو خوش کرنے کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہیں خدا سے بھی متعلق کر دی گئیں اور عبادت یا حمد و ثنا کی صورت بھی تقریباً وہی قرار دی گئی جو کسی دربارِ شاہی میں رعایا و خدام کی طرف سے زمیں بوسی وغیرہ کی صورت میں نظر آتی ہے۔ اور ان میں سوائے اس کے کوئی فرق نہ رکھا گیا کہ خدا کی تعریف کا نام "حمد" رکھدیا اور بادشاہ کی تعریف کا (بہ تبدیلی حروف) مدح اُس کو "خدا" کے لفظ سے یاد کرتے تھے تو اس کو اور چند حروف کے اضافہ کے ساتھ "خداوند" کہنے لگے۔ انھوں نے سوچا کہ اگر بادشاہ تعریف سے خوش ہو کر انعام و اکرام کرتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ خدا بھی خوش ہو کر بخشش و عطا سے کام نہ لے اور اگر بادشاہ بغاوت اور عدولِ حکم سے برہم ہوتا ہے تو یقیناً خدا کو بھی سرکشی و نافرمانی سے غضبناک ہونا چاہئے

میں یہاں اس امر سے بحث نہ کروں گا کہ خدا کا یہ تصور اور عبادت کا یہ فلسفہ بجائے خود کسقدر لغو و مہمل ہے، کیونکہ موضوع زیر بحث سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ درود شریف یا کسی اور طریق عبادت سے انسان کو تسکین ہونا چاہئے یا نہیں۔

جب خدا اور بندہ کا تعلق وہی قرار پایا جو آقا و خادم یا مولیٰ و غلام کا ہے تو یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ حصولِ مقصود کے لئے جو ذرایع یہاں موثر ہو سکتے ہیں وہی وہاں بھی کارگر سمجھے جائیں گے اور جس طرح یہاں انسان کو اپنی امیدوں کی تکمیل کے خیال سے تسکین پہونچتی ہے اسی طرح وہاں کی آرزوؤں کی تکمیل کے خیال سے بھی پہونچنا چاہئے۔ میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ خدا کی عبادت کسی غرض پر مبنی نہیں ہے، دنیاوی ثروت و دولت نہ سہی، اخروی آسایش و راحت تو ہے۔ "زہرۂ صبح و جام بلور" نہ سہی، جنت کا "موتی محل" اور وہاں کی "اچھوتی حور" تو ہے؟ اور زیادہ بلند جائیے، قرب خداوندی کی تمنا تو ہے؟ اس سے زیادہ اور عمیق فلسفہ تراشی کیجئے۔ حیز اصلی میں گم ہونا تو ہے، حدود و تعینات سے گزر کر لا متناہی میں جذب ہو جانا تو ہے؟ بہرحال عبادت کا خیال خواہ وہ کسی نہج و صورت سے ہو، غرض سے خالی نہیں ہے اور اگر ہمیں یہ یقین ہو جائے کہ ہماری کوئی غرض ہمارے کسی قول و فعل سے پوری ہو سکتی ہے تو اس قول یا فعل سے تسکین ہونا ضروری ہے۔

بنا بریں اگر درود شریف کے وِرد سے آپ کو تسکین ہوتی ہے تو اس کا کھلا ہوا نفسیاتی سبب موجود ہے اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نفس درود شریف کے الفاظ میں کوئی خاص اثر پوشیدہ ہے

اور ہر شخص اس سے وہی تسکین حاصل کر سکتا ہے جو آپ کو حاصل ہوتی ہے۔

درود شریف کے ورد سے جو سکونِ قلب آپ کو میسر آتا ہے، بالکل وہی ایک ہندو کو گائتری کے پڑھنے سے ایک عیسائی کو دعائے یسوع کے ورد سے حاصل ہوتا ہے اور اس سے بہ آسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حقیقتاً نہ درود کے الفاظ میں کوئی طلسمی اثر موجود ہے نہ گائتری اور دعائے یسوع میں بلکہ اس کا تعلق خود اپنے اعتقاد و یقین سے ہے۔ آپ ایک ہندو سے کہئے کہ وہ درود پڑھا کرے اور آپ گائتری کا جاپ کیجئے نہ آپ کو تسکین حاصل ہوگی نہ ہندو کو۔

اگر آپ کو درود شریف اور نماز سے کوئی ذہنی فایدہ پہونچتا ہے تو یقیناً آپ کو اسکی پابندی کرنا چاہئے اور تمام ایسے نفوس کے لئے جو بغیر اس قسم کی تدابیر کے اپنی وحشت نہیں کھو سکتے، علاج کی یہی صورت مناسب ہے۔ آپ نے وہ قصہ پڑھا ہوگا کہ لومڑی ایک شیر کو ہلاک کرنے کے لئے کس طرح اس کو ایک کنوئیں پر لے گئی اور وہاں پہونچکر جب شیر نے پانی میں اپنا عکس دیکھا تو یہ سمجھ کر کہ کوئی دوسرا شیر جنگل میں آگیا ہے اس پر حملہ کرنے کے لئے کنوئیں کے اندر پھاند پڑا ——— یہ اوراد و وظائف بھی بالکل اسی قسم کی ترکیبیں ہیں اور انھیں لوگوں کے لئے جنکی درندگی بغیر اس شکنجہ کے دور نہیں ہو سکتی۔

اب رہا نفس "درود شریف" کے دعا ہونے کا مسئلہ، سو "درود شریف" ایک دعا و التجا تو ضرور ہے لیکن اپنے لئے نہیں دوسروں کے لئے ــ عام طور پر درود شریف میں جو الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں وہ یہ ہیں:۔

"اللہم صل علے محمد و علی آل محمد و اصحابہ"۔ حضرات شیعہ "آلِ محمد" سے آگے نہیں بڑھتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ "اے خدا محمد، و آلِ محمد و اصحابِ رسول پر برکت نازل کر"۔ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ پر نزولِ برکات کی دعا سے خدا خوش ہوتا ہے اور دعا مانگنے والے کو بھی اس کا ثواب ملتا ہے۔ ثواب سے مراد وہی خوشنودی خدا، وہی اعمال سیئہ کی معافی اور آخر کار وہی بہشت و کوثر یا قرب خداوندی ہے جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے۔

درود میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ درود پڑھنے والا خود کوئی خواہش اپنی پیش کرتا ہے بلکہ وہ رسول و آلِ رسول کے لئے دعا کرتا ہے۔ درانحالیکہ ایسی برگزیدہ ہستیوں کے لئے نزول برکات کی دعا کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے یہ کہنا کہ

دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

میں نہیں سمجھتا کہ "تحصیلِ حاصل" کی اس سے زیادہ بہتر مثال کوئی اور پیش کی جا سکتی ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ آپ درود کا ورد اس کو سمجھ کر کرتے ہیں یا بغیر سمجھے لیکن گمان غالب یہی ہے کہ اس کے مفہوم پر غور کئے بغیر یہ مشغلہ جاری رکھتے ہیں ورنہ یہ تسکین و سکینہ سب ختم ہو جاتی اور میری ہی طرح آپ بھی گمراہ ہو جاتے۔

دو حقیقتیں

یہ نظم میرے عزیز دوست پنڈت آنند نراین مُلا کی ہے جو لکھنؤ کے دورِ حاضر کے شعراء میں خاص امتیاز رکھتے ہیں آپ غزل بھی کہتے ہیں اور نظمیں بھی، لیکن اگر آپ مجھ سے یہ پوچھیں کہ ان کی غزلیں زیادہ کامیاب ہوتی ہیں یا نظمیں تو میں اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتا، کیونکہ جس وقت ان کی غزل میری نگاہ سے گزرتی ہو تو میں ان کی نظموں کو بھول جاتا ہوں اور جب نظمیں پڑھتا ہوں تو غزلیں محو ہو جاتی ہیں۔

ذیل کی نظم میں شاعر نے جس نزاکت خیال اور فلسفیانہ انداز سے اپنے مقصد کو پیش کیا ہے وہ داد سے مستغنی ہے۔

(اڈیٹر)

مرے ترقی پسند اک دوست، کل یہ تقریر کر رہے تھے
ہر اک خرابیِ دورِ حاضر مجھی سے تعبیر کر رہے تھے،

یہ کہہ رہے تھے" بنا ہی تو ہی تمام باطل پرستیوں کی
ترے ہی دل میں ہیں خیمہ گاہیں، مذاقِ انسانی پستیوں کی

ترے ہی خوابوں کی چادروں سے، نقوشِ ہستی چھپے ہوئے ہیں
ترے ہی جالے ہر ایک ایوانِ زندگی میں لگے ہوئے ہیں

وہی فسانے خلافِ فطرت، ابھی ترے لب سنا رہے ہیں
وہی قدامت کے مقبروں میں ترے دئے ٹمٹما رہے ہیں

جہاں میں دو ہی حقیقتیں ہیں، ہے جن پہ دار و مدارِ ہستی
ہے جن سے قائم نظامِ عالم، ہے جن کے دم سے بہارِ ہستی"

ہر ایک اُنمیں سے جسمِ عورت کا، دوسری جیبِ مرد کی ہے
جہاں کی ہر شاہراہِ اخلاق، انھیں کے قدموں کی گرد کی ہے

ہر ایک تمدن کا خوں کیا ہے، ہر ایک تہذیب خاک کی ہے
ہمیشہ دستِ ہوس سے اپنے، نقابِ فطرت کی چاک کی ہے

ہر ایک گنبد میں زندگانی کے گونجتی ہیں صدائیں انکی
گرا رہی ہیں ہر انقلابِ دنیا کے زلزلوں میں بنائیں انکی

جہاں میں تیرے سے چند ناداں، جو نامِ اُلفت کا لے رہے ہیں
وہ یا تو خود کھا رہے ہیں دھوکا نہیں تو دھوکا سا دے رہے ہیں

کہاں گزران لطافتوں کا حیات کی سخت منزلوں میں
انھیں تو بھول آئی کب کی دنیا، ترے تصور کی منزلوں میں

مثال حرفِ غلط اسے لوحِ زندگی سے مٹائیں گی یہ
ہوائے دنیا کے رخ پہ رکھ کر، چراغ تیرا بجھائیں گی یہ

حیات کو اک ایک دن یہ برہنگی کا پیام دیں گی،
ترے جنازے کو دوش پر لیکے، دعوتِ رقصِ عام دیں گی

اگر یہی دو حقیقتیں ہیں، تو میں یقیناً ہوں نقشِ باطل
اگر محبت ہے زہر ہستی، تو شعر میرے ہیں سمِ قاتل

مگر یہ کیا بات ہے؟ کہ جب ایک دوسرے سے یہ چار ہونگی
ہنسی اُڑاتی ہیں جیسے میری، اُسی طرح بیقرار ہوں گی

بڑھیں گی اک دوسرے کی جانب، مرا پیامِ نگاہ لیکر
مرے ہی سینہ سے آگ لیکر مرے ہی ہونٹوں سے آہ لیکر

سنائیں گی یہ بصد ترنم، کبھی نظر سے، کبھی زباں سے
وہی ترانے، اُڑا لئے ہیں جو میرے لبہائے خونچکاں سے

مرے تصور سے رنگ لیں گی، مرے ہی خوابوں سے نور لیں گی
مری تمناؤں کے خزانوں سے، اپنے موتی ضرور لیں گی،

الٰہی کس ارتقا کے مرکز کے سمت تہذیب جا رہی ہے
کہ جیسے انسانیت سے اپنی، البشر کو خود شرم آ رہی ہے

یہ عقل کی مادہ پرستی، مزاجِ دنیا بدل رہی ہے
یہ روحِ انساں کو رکھ کے اپنے قدم کے نیچے کچل رہی ہے

مجھے یہ تسلیم میں بشر ہوں، جگر میں پانی نہیں، لہو ہے
ہزار ہیں دل میں آرزوئیں، مگر یہی جانِ آرزو ہے

مری امیدیں، مری امنگوں کے چاہے کام آئیں یا نہ آئیں
مرے ستارے بغیر چمکے ہی، چاہے سینے میں ڈوب جائیں

مگر میں اس بد مذاق دنیا سے ایک دن انتقام لے لوں
میں اپنے خونِ جگر کے قطروں سے، کاش اتنا ہی کام لے لوں

بڑے جو بنتے ہیں عقل والے، اُنھیں بھی دل کا پیام دیدوں
سحر کے بے روح پیکروں کو، حرارتِ خونِ شام دیدوں

جھلے ہوئے ہیں جو برف میں دل، اُنھیں بھی اک شعلہ زار کر دوں
جہاں کی سیلی ہوئی فضاؤں کو، برق سے ہمکنار کر دوں

اپنی خوابگاہ کے دریچے سے

یہ نظم میرے مخلص دوست جناب اختر اکبرآبادی کی ہے اور پنڈت آنند نرائن ملا کی نظم کے ساتھ میں اسکو اسلئے درج کرتا ہوں تاکہ لوگ سمجھیں کہ حقیقت دنیا میں ہمیشہ ایک ہی رہی ہے اور جب دل کی گرہ اس سے کھلنے لگتی ہے تو ہر زبان سے ایک ہی قسم کی آواز پیدا ہوتی ہے - (اڈیٹر)

میں دور دنیا کی شورشوں سے یہاں کھڑا مسکرا رہا ہوں
جھلک رہی ہیں فلک پہ تارے، میں چشم حیرت بنا ہوا ہوں

یہ رات، یہ خامشی فضا کی، یہ چاند کی پرسکوت لہریں
فضا کی خنکی میں منتشر ہیں شباب کی بادہ بار موجیں

بلندیوں پر نظر کشِ موجِ ذوقِ خاموش ایرئیل ہے
جبینِ کبر و غنا پہ گویا یہ کسلِ عشرت کے تازہ بل ہیں،

حجاب سے بادلوں کے مجھ کو بلا رہا ہے کوئی فرشتہ
تجلیوں کا یہ ہی تصرف کہ اب نظر بھی ہے عین جلوہ

وہ اک دریچہ کھلا فلک کا وہ ایک معصوم حور جھانکی،
وہ کہکشاں کے قریب سے آئی مجھ کو آواز کارواں کی

پری اک اتری زمیں کی جانب فلک سے اوڑھے سفید چادر
کنار میں ہے رعب بھلی مینا، تو ہاتھ میں ہے سنہری ساغر

وہ مشتری کی جبیں سے ٹپکے حیا کے کچھ گرم گرم قطرے
وہ چھنتے آئی فلک سے زہرا مئے خودی کے شکستہ شیشے،

وہ سن سے گزرا فضائے بالا میں ڈر کے سایوں سے ایک طائر
کہ جیسے اپنی ہی سرخ تخئیل سے کوئی چونک جائے شاعر

فلک پہ ہے زندگی درخشاں، فلک پہ خوشیاں برس رہی ہیں
زمیں کی تاریکیاں ابھی تک تجلیوں کو ترس رہی ہیں!

یہاں کی خاموشیوں میں افسردہ موت انگڑائی لے رہی ہے،
جفا کے تیور چڑھے ہوئے ہیں، وفا کی جنت اجڑ چلی ہے

وہ ایک ڈاکو نے بیگناہوں کے سر کو آخر کچل کے چھوڑا
وہ ایک مفلس نے زندگی کی رگوں کا سارا لہو نچوڑا،

وہ نامرادِ وفا اک اٹھا زمانے سے انتقام لینے
وہ ایک "بیکار" جا رہا ہے شکست قسمت سے کام لینے

وہ ایک معصوم کے گلے پر ابھی ستم کی چھری چلی ہے
وہ سامنے اک مکاں سے ابتک صدائے فریاد آرہی ہے

وہ گود میں لیکے آئی دنیا فریب عشرت کا نقش تازہ
وہ جا رہا ہے کوئی خموشی سے لیکے ہاتھوں پر اک جنازہ

امیر "حور دل" کے ساتھ اسوقت گا رہے ہیں سکوں کے نغمے
غریب کی نیند اڑ چکی ہے گلی کے کتوں کے شور و غل سے

وہ اک ہوس کے گندے ہاتھوں نے بڑھ کے عصمت کے پھول نوچے
وہ ایک یا ہو نژاد انساں نے غم کے تازہ طریق سوچے

وہ ایک پردے سے ہو رہے ہیں گناہ کے بے شمار اشارے
وہ اک شرابی کی شعلہ کاری اگل رہی ہے نئے شرارے

وہ اک سپاہی نے ایک قیدی کے سرد سینے پہ آگ رکھ دی
وہ چھپ کے شیطان نے جیل خانے کی اک پرانی سلاخ توڑی،

وہ اک برہمن نظر بچا کر چرا رہا ہے بتوں کے گہنے
وہ ایک مسجد میں شیخ اپنے خدا کو دینے چلا ہے دھوکے

اختر یہ دنیا ہے اک جہنم، اختر یہ انساں جہنمی ہے
یہاں ہیں شیطان گو ہزاروں خدا کی لیکن ابھی کمی ہے

Yahoo Aerial

آرام شاہ

(سنہ ۶۰۷ھ ۱۲۱۰ء)

قطب الدین ایبک کے بعد اس کا بیٹا آرام شاہ تخت نشین ہوا، لیکن اُس نے صرف ایک سال حکومت کی ہوگی، کہ کئی صوبے ہاتھ سے نکل گئے اور آخر کار التتمش جو اُس وقت بداؤں کا گورنر تھا تخت نشین کیا گیا۔ منہاج سراج کا بیان ہے کہ آرام کے انتقال کے وقت حکومتِ ہندوستان چار حصوں میں منقسم تھی۔ سندھ میں ناصر الدین قباچہ حکمران تھا۔ دہلی اور اُسکے ماتحت صوبے شمس الدین التتمش کے پاس تھے۔ لکھنوتی پر خلجی خاندان متصرف تھا (کیونکہ قطب الدین کی وفات پر علی مردان نے خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا) اور لاہور، فرمانروایانِ دہلی، سندھ اور لاہور کے درمیان استخوانِ جنگ بنا ہوا تھا۔

شمس الدین التتمش

(سنہ ۶۰۷ - ۶۳۳ھ
۱۲۱۰ - ۱۲۳۵ء)

جو نسبت ایبک کو محمد غوری کے ساتھ حاصل تھی وہی التتمش کو ایبک کے ساتھ تھی۔ صاحب طبقاتِ ناصری نے بیان کیا ہے کہ التتمش ترکی نژاد تھا اور "قبائل البری" سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے باپ کا نام ایلم خان تھا اور نہایت کم سنی سے یہ بے انتہا ذہین تھا۔ اس کے بھائیوں نے از راہ حسد اُسے ایک سوداگر کے ہاتھ فروخت کر دیا اور یہ سوداگر دوسرے غلاموں کے ساتھ اسے غزنی لے آیا، جہاں قطب الدین ایبک نے اُسے اور غلاموں کے ساتھ ایک لاکھ جیتل میں خریدا اور اپنے ساتھ دہلی لے آیا۔ ایبک اسے اپنے بیٹوں کی طرح رکھتا تھا اور یہ بھی اپنے حسن خدمات سے ایبک کی نگاہوں میں خاص وقعت و عزت حاصل کرتا جاتا تھا، حتیٰ کہ رفتہ رفتہ ایبک نے اُسے امیر شکار بنا دیا اور پھر یکے بعد دیگرے گوالیار، برن اور بداؤں کی گورنری اُسے دی گئی۔ چنانچہ جب آرام شاہ تخت نشین ہوا تو یہ برن یا بداؤں ہی میں تھا اور امرائے دہلی نے یہیں سے اُسے طلب کر کے بجائے آرام شاہ کے تخت نشین کیا۔

لفظ التتمش کے رسمِ خط اور معنی کے متعلق مورخین کا اختلاف ہے۔ وصاف نے اس کو ارتمش قرار دیا ہے۔ اور بعض التوتمش اور ایلتمش کہتے ہیں۔ برگز نے تاریخ فرشتہ کے ترجمہ میں ظاہر کیا ہے کہ التمش موجودہ ترکی زبان میں

"ساٹھ" کو کہتے ہیں اور چونکہ اول مرتبہ بازار میں اس کی قیمت ساٹھ تومان قرار پائی تھی اس لئے اُسے التمش کہنے لگے۔ ملا بدایونی نے لکھا ہے کہ

"وجہ تسمیہ بہ التیمش آنست کہ تولد وے در شب گرفت ماہ[1] واقع شد و ترکان ایں چنیں مولد را التیمش می گویند"

مسٹر ڈہاؤس نے جو ترکی زبان کا بہت بڑا محقق ہے بدایونی کے اس بیان کو صحیح مان کر ظاہر کیا ہے کہ ترکی میں "اے" چاند کو کہتے ہیں اور "تومش" صیغہ معروف ہے جس کے معنی ہیں "اسے گھنا دیا" اس کا مجہول تو تلمش ہے جسکے معنی ہیں "گھنایا ہوا"۔ اس لئے اگر بدایونی کا بیان صحیح ہو تو بھی اصل نام حسب قاعدہ ترکی زبان اسے تو تلمش ہونا چاہئے، لیکن اسکے سکوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح لفظ التتمش ہے۔

جسوقت التتمش تخت نشین ہوا تو تاج الدین یلدوز نے، جو غزنی میں شہاب الدین غوری کے بعد حکمراں تھا، مصلحت اسی میں دیکھی کہ اُس سے مصالحت کرلے، چنانچہ اُس نے "چتر و دورباش" (جو علامت تھی خود مختار حکومت و سلطنت کی) اس کے پاس بھیجدیا۔ قباچہ نے البتہ اطاعت کرنے سے انکار کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۶۱۳-۶۱۴ھ میں اس نے قباچہ کو شکست دیکر پنجاب کے سارے شمالی حصہ کو فتح کرلیا اور اپنے بیٹے ناصر الدین محمود کو وہاں کا حاکم مقرر کیا۔

ہر چند ہندوستان کے اندر بھی التتمش کے لئے کچھ نہ کچھ وجہ خلش پائی جاتی تھی لیکن سب سے بڑا خطرہ جس نے سارے ایشیا کو سہما دیا تھا مغلوں کا تھا۔

چنگیز خاں کا خروج ہو چکا تھا اور وہ سیل فتنہ جو وسط ایشیا سے اُٹھا تھا اُس کی لہریں چاروں طرف ٹکرا رہی تھیں چنانچہ اُس کی سب سے پہلی علامت جس کا اثر ہندوستان پر پڑ سکتا تھا یلدوز کی فراری تھی جو خوارزم شاہ کی شکست خوردہ فوج کے آگے آگے اُس سے مغلوب ہو کر ہندوستان میں بھاگ آیا اور حدود ترائین میں التتمش کی فوج سے اُس کا مقابلہ ہوا[2]۔

حالت یہ تھی کہ یکے بعد دیگرے شکست خوردہ اور پیچھا کرنے والی جماعتیں ہندوستان میں آرہی تھیں، پہلے ترکی گورنروں نے ہند کا رُخ کیا۔ اس کے بعد جلال الدین جو خوارزم کا آخری بادشاہ اور سمرقند و بخارا سے ہرات و اسفہان تک وسیع سلطنت کا حقدار تھا، دریائے سندھ تک پہونچا اور پھر اُس کے تعاقب میں چنگیز خاں آیا جس نے ۶۱۸ھ ۱۲۲۱ء میں جلال الدین کو یہاں سے بھی بھگا کر اندرون سندھ تک پہونچا دیا۔

اس میں شک نہیں کہ یہ طوفان نہایت ہولناک تھا لیکن جس زور شور سے اُس نے ہندوستان کا رُخ کیا تھا

---

[1] "گرفت ماہ" چاند گہن کو کہتے ہیں۔ [2] یہ اس جنگ میں گرفتار ہوا اور بدایوں مقید کرکے بھیجدیا گیا بعد کو یہیں مر گیا یا قتل ہوا اس کی قبر بدایوں میں موجود ہے (طبقات ناصری صفحہ ۱۲۵)

اُسی سرعت کے ساتھ یہ کم بھی ہوگیا کیونکہ مغلوں کی جماعت زیادہ تر مغرب کی طرف مائل تھی اور ہندوستان کو انھوں نے خوش قسمتی سے زیادہ قابلِ وقعت نہیں سمجھا۔

التمش کی فتوحات

جب التمش اس عہدِ فتنہ سے گزر گیا تو اُس کی قوت اور زیادہ ہوگئی کیونکہ یلدوز و قباچہ دونوں صفحۂ تاریخ سے غائب ہوچکے تھے۔ ایک مقید ہوکر اپنی زندگی ختم کرچکا تھا اور دوسرا مغلوں اور خوارزم شاہیوں سے مغلوب ہونے کے بعد فرار ہوکر اور دریائے سندھ میں ڈوب کر اپنی جان دے چکا تھا (۶۲۵ھ ۱۲۲۸ء)۔

اس سے قبل ۶۲۲ھ ۱۲۲۵ء میں التمش نے خود بنگال جاکر اپنا اقتدار وہاں قائم کرلیا تھا اور وہاں کے گورنر غیاث الدین نے جو اس وقت تک وہاں بالکل خود مختار تھا، اطاعت اختیار کرلی تھی۔ علاوہ اس کے رنتھنبور (۶۲۳ھ ۱۲۲۶ء) مندور (۶۲۴ھ ۱۲۲۷ء) اوچھ (۶۲۵ھ ۱۲۲۸ء) اور گوالیار (۶۳۰ھ ۱۲۳۲ء) پر بھی قبضہ حاصل ہوگیا اور مالوہ، بھیلسہ، اوجین (۶۳۲ھ ۱۲۳۵ء) اور ملتان (۶۳۳ھ ۱۲۳۶ء) کی کامیاب مہموں نے بھی التمش کی سلطنت کو بہت زیادہ مستحکم بنا دیا۔

عہدِ التمش کے اہلِ علم و فن

ہرچند التمش کی زندگی زیادہ تر سیاسی مشاغل اور افکارِ جنگ و حرب میں بسر ہوئی لیکن پھر بھی اُسکی فیاضیوں نے دہلی کو علما و فضلا کا مرکز بنا رکھا تھا۔ قاضی حمید الدین ناگوری، مُلّا عماد الدین، مُلّا جمال الدین اسی عہد کے درخشندہ جوہر تھے۔ فخر الملک عطائی جو تیس سال تک وزیرِ بغداد رہ چکا تھا اور کمالاتِ ظاہر و باطن میں شہرتِ تامہ رکھتا تھا سلطان التمش کے دربار میں آیا اور اُسی کی قدرشناسی نے اُسے منصبِ وزارت پر متمکن کیا۔ نور الدین محمد عوفی (جامع الحکایات کا مصنف) اسی کے زمانہ میں تھا۔ جب چنگیز خانی فتنہ سے وسط ایشیا درہم و برہم ہورہا تھا تو بہت سے علماء و فضلاء ہندوستان کی طرف بھاگ آئے اور انھیں میں امیر روحانی بھی تھا جو بخارا سے دہلی آیا اور التمش نے اُس کی بہت قدر کی یہ شخص اپنے عہد کا بہت بڑا شاعر تھا۔ فتوحاتِ التمش میں اس کے یہ اشعارِ تہنیت خاص شہرت رکھتے ہیں:۔

خبر بہ اہلِ سما بُرد جبرئیل امین ز فتحنامۂ سلطان عہد شمس الدین

کہ اے ملائکہ قدس آسمانہا را بدیں بشارتے بندید کلہ و آئین

کہ از بلادِ سوالک شہنشہِ اسلام کشاد بار دگر قلعۂ سپھر.... آئین

شہِ مجاہد و غازی کہ دستِ تیغش را ردانِ حیدرِ کرار می کند تحسین[1]

درسگاہ

اُس نے ایک بہت بڑی درسگاہ تعمیر کرائی تھی جہاں دور دور سے طلبہ آتے تھے اور وظائف حاصل کرکے تحصیلِ علوم میں مشغول رہتے تھے، فیروز شاہ تغلق ایک صدی سے زیادہ زمانہ گزرنے کے بعد اپنی فتوحاتِ فیروز شاہی میں اس مدرسہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

"مدرسہ سلطان شمس الدین التمش مسمار ہوچکا تھا میں نے دوبارہ اُس کی تعمیر کرائی اور صندل کے دروازے لگوائے"

---

[1] فرشتہ جلد ۱ صفحہ ۶۷۔

علاوہ اس کے ستون صحن، گنبد وغیرہ کو بھی از سر نو تعمیر کرایا۔"

اسی سلسلہ میں فیروز شاہ تغلق نے اُس تالاب کا بھی ذکر کیا ہے جو حوض شمسی کے نام سے مشہور ہے۔ فیروز شاہ تغلق نے اس کی مرمت کرائی اور پانی آنے کے جو راستے مسدود کر دئے گئے تھے اُن کو صاف کرایا۔[1]

ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ:-

"شمس الدین التمش بڑا صالح اور عادل بادشاہ تھا، دادرسی کی طرف اُسے خاص توجہ تھی چنانچہ اُس نے حکم دے دیا تھا کہ سوائے فریادی اور مظلوم کے اور کوئی شخص رنگین کپڑے نہ پہنے۔ چنانچہ جب وہ کسی کو رنگین ملبوس میں دیکھتا تو سمجھ جاتا کہ اس پر ظلم ہوا ہے اور فوراً بلا کر اُس سے حالات دریافت کرتا۔ انصاف کرنے کے لئے وہ شب و روز ہر وقت مستعد رہتا تھا۔ اس نے محل کے دروازہ پر دو شیر سنگ مرمر کے رکھے اور اُن کے گلے میں دو آہنی زنجیریں ڈال کر اُن میں گھنٹیاں لٹکا دیں۔ جب کوئی مظلوم رات کو آتا تو زنجیر کو جنبش دیتا اور سلطان فوراً قصر سے باہر آکر اُس کی فریاد سنتا۔"

۶۲۶ھ میں خلافت عباسیہ نے ہندوستان کو ایک مستقل اور جداگانہ سلطنت تسلیم کرکے جامۂ خلافت سلطان التمش کے لئے روانہ کیا اور اُس نے حد درجہ فخر و مباہات کا اظہار کرکے جامۂ عباسی کو قبول کیا اور تمام امرائے دربار کو خلعت و انعامات سے سرفراز کیا۔[2]

عہد التمش سے پہلے سکوں پر کہیں عربی اور کہیں ناگری رسم خط میں حکمران کا نام لکھا جاتا تھا اور دیگر علامات بھی وہی ہوتی تھیں جو ہندوستان کے لئے موزوں تھیں یا قبل سے رائج تھیں مثلاً شیو کا بیل وغیرہ، لیکن التمش نے سب سے پہلے خالص چاندی کا تنکہ (جس کا وزن ۱۷۵ گرین کا تھا) رائج کیا اور اس پر عربی خط میں اپنا نام وغیرہ منقوش کر دیا۔ طلائی تنکہ اُس نے نہیں بنایا بلکہ نصف صدی بعد عہد بلبن میں رائج ہوا۔

التمش نے ۲۶ سال تک حکومت کی اور شعبان ۶۳۳ھ (اپریل ۱۲۳۶ء) میں بنیان کی مہم سے واپس آکر دہلی میں انتقال کیا۔

منہاج سراج (صاحب طبقات ناصری) کا بیان ہے کہ جرأت و سیاست، شرافت نفس، ذہانت طبع، علم دوستی و ہنر پروری، عالی حوصلگی و دریا دلی، کریم الاخلاقی و فیاضی میں اس کا نظیر مشکل سے مل سکتا ہے اور عدل و انصاف کی طرف اُسے وہی توجہ تھی جو ایک فرمانروا کو ہونی چاہئے۔

---

[1] فتوحات فیروز شاہی۔ جلد ۳۔ صفحہ ۳۸۳۔

[2] فرشتہ جلد ا صفحہ ۶۶۔

ہندوستان ۶۳۳ھ (۱۲۳۶ء) میں

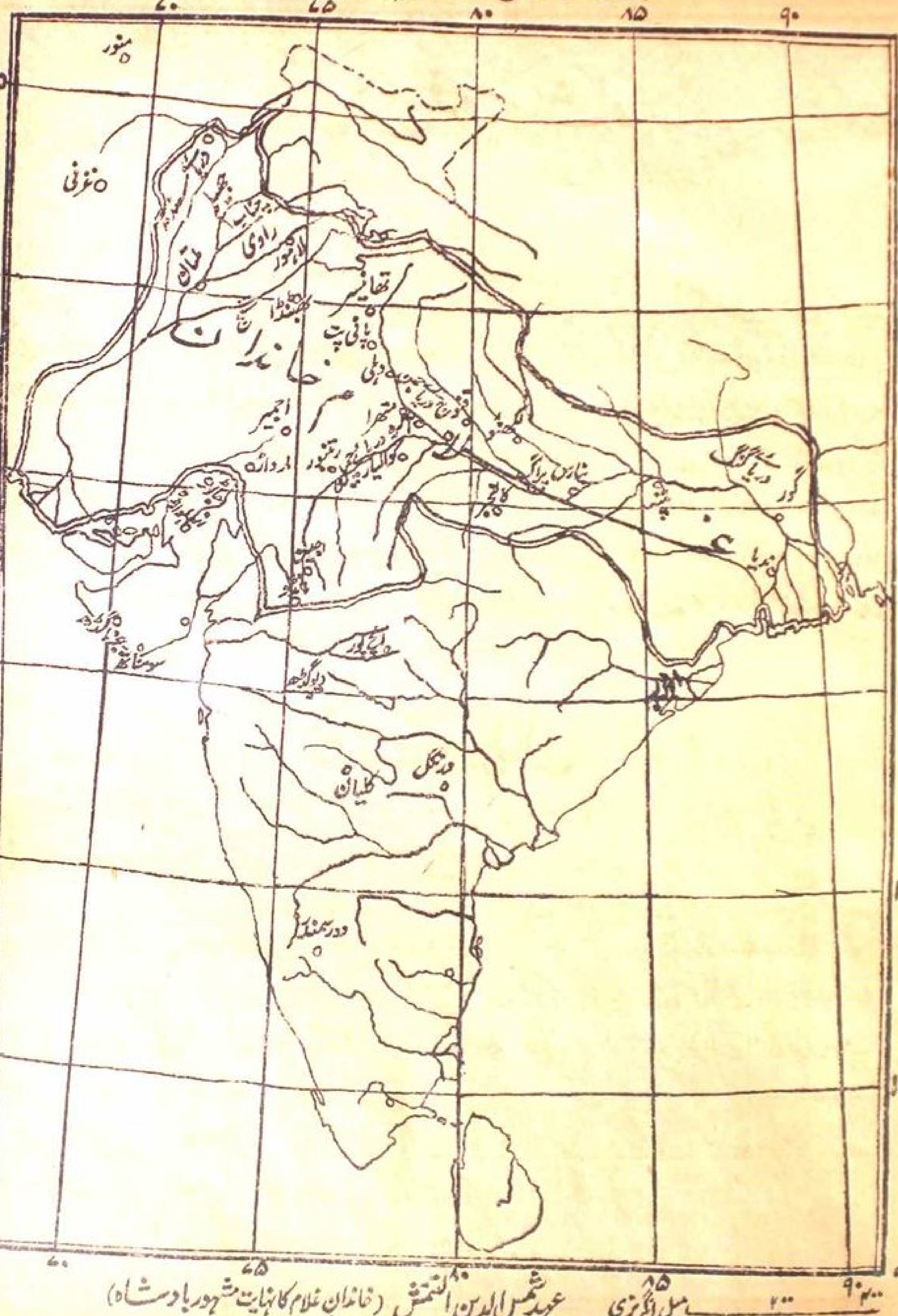

عہدِ شمس الدین التمش (خاندانِ غلام کا نہایت مشہور بادشاہ)

رکن الدین فیروز شاہ

(۶۳۳-۶۳۴ھ
۱۲۳۵-۱۲۳۶ء)

التمش کے بعد اُس کا بیٹا رکن الدین فیروز شاہ تخت نشین ہوا۔ لیکن یہ اپنے باپ کے اُصولِ جہانبانی پر کاربند نہیں رہا اور اس نے شاہی خزانہ کو نہایت بیدردی سے اُڑانا شروع کیا۔ اس کے عیش و عشرت کی زندگی اور انتظام سلطنت کی طرف سے بے پروائی نے بہت جلد امراءِ سلطنت کو اس کی طرف سے منحرف کردیا، اُسکی ماں شاہ ترکان نے اپنے بیٹے کی غفلت سے ناجائز فایدہ اُٹھاکر قصر کے اندر سخت مظالم شروع کر دئے اور التمش کی بہت سی حرموں کو تہ تیغ کرادیا۔ آخر کار جب اُس نے التمش کے سب سے چھوٹے بیٹے شاہزادہ قطب الدین کو جو دوسری بیوی کے بطن سے تھا قتل کردیا، تو التمش کی بیٹی رضیۃ الدین نے صدائے احتجاج بلند کی اور امرا نے شاہ ترکان کو مقید کرکے رضیہ کو تخت نشین کردیا۔ سلطان رکن الدین اس وقت دہلی سے باہر بغاوتوں[1] کے فرو کرنے میں مصروف تھا۔ جب یہ واپس آیا تو یہاں کا رنگ ہی دوسرا تھا۔ آخر کار یہ بھی قید ہوا اور صرف ۶ ماہ ۲۸ روز سلطنت کرسکا۔[2]

رضیہ سلطان

(۶۳۴-۶۳۷ھ
۹۳۶-۱۲۳۹ء)

غلام خاندان میں رضیہ سلطان کا عہد خاص طور سے نمایاں نظر آتا ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ عورت تھی اور دوسرا سبب یہ ہے کہ وہ حقیقۃً اپنے اندر ایسے صفاتِ جہانبانی رکھتی تھی جو مردوں میں بھی مشکل سے پائے جاتے ہیں۔ شمس الدین التمش خود اس بات کو اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ اُس کی تمام اولاد میں صرف رضیہ اس قابل ہے کہ

---

[1] اودھ میں محمد شاہ (رکن الدین کے چھوٹے بھائی) نے بغاوت شروع کی۔ بدایوں میں عزالدین سالاری نے۔ ملتان میں عزالدین کبیر خاں ایاز نے۔ ہانسی میں ملک سیف الدین نے اور لاہور میں ملک علاء الدین جانی نے۔

[2] فرشتہ جلد ۱ صفحہ ۶۸۔ طبقات ناصری جلد ۲۔ صفحہ ۳۳۰ و ۳۳۱

عنانِ سلطنت اُس کے ہاتھ میں دی جائے، چنانچہ جب وہ فتحِ گوالیار سے واپس آیا تو حکم دیا کہ رضیہ اُس کی ولی عہد تسلیم کی جائے۔ اس سے بعض لوگوں نے دریافت بھی کیا کہ متعدد اولاد نرینہ ہونے کی حالت میں لڑکی کو ولی عہد بنانا کس حکمت پر مبنی ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ "میرے بیٹے ہوا و ہوس میں مبتلا ہیں اور اُن میں ایک بھی اس قابل نہیں کہ انتظام سلطنت کر سکے۔ رضیہ ہر چند صورتاً عورت ہے لیکن بہ لحاظ اپنی صفات کے ایک مرد ہے اور اپنے تمام بھائیوں سے افضل ہے[1]"

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں تین مسلمان عورتیں فرمانروا ہوئیں اور اُنھوں نے نہایت شہرت حاصل کی۔ ایک شجرۃ الدُر، مصر میں مملوک خاندان کی ملکہ تھی، جس نے حروبِ صلیبیہ میں فرانس کے بادشاہ لوئی نہم کو شکست دی۔ دوسری ابش جس نے مغلوں کی نشو و ترقی کے زمانہ میں تقریباً ایک ربع صدی تک فارس میں حکومت کی، اور تیسری رضیہ جو ہر چند صرف ساڑھے تین سال ہندوستان پر حکمران رہی لیکن اس مختصر زمانہ میں حسنِ انتظام سے اپنے تئیں غیر فانی بنا گئی اور تاریخ میں وہ واقعات چھوڑ گئی جن پر اُس کی جنس کو ہمیشہ فخر و ناز رہے گا۔

افسوس ہے کہ کتبِ تاریخ سے رضیہ کی تعلیم و تربیت کا مفصل حال معلوم نہیں ہوتا لیکن یہ یقینی ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت کی طرف سلطان التمش نے پوری توجہ سے کام لیا ہوگا کیونکہ طبقاتِ ناصری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے[2] کہ اس کی ماں سلطان کی نہایت محبوب بیوی تھی اور کوشکِ فیروزی میں خاص قصرِ شاہی اس کا قیام گاہ تھا۔

فرشتہ نے اُس کے اکتسابات علمیہ کے متعلق صرف اس قدر لکھا ہے کہ "قرآن مجید را بہ آداب می خواند از بعضے علوم فی الجملہ نصیبے داشت"۔ اس سے ظاہر ہے کہ اُس زمانہ میں جس قدر تعلیم لڑکیوں کے لئے ضروری تھی وہ سب اس نے حاصل کی تھی۔ رہی تربیت سو اس کے متعلق بھی مورخ مذکور کی یہ رائے ہے کہ "جو صفات شاہانِ ذی عقل و صاحب رائے کے لئے ضروری ہیں وہ سب کے سب رضیہ میں موجود تھے۔ اور اُس عہد کے تمام صاحبانِ نظر نے اسکو تسلیم کر لیا تھا کہ رضیہ اگر مرد ہوتی تو پھر چون و چرا کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔"

رضیہ نے تخت نشین ہوتے ہی تمام اُن قواعد و ضوابط کو جو اس کے باپ کے عہد میں رائج تھے اور رکن الدین کے زمانہ میں باطل ہو چکے تھے از سر نو قایم کیا اور بکمال احتیاط کے ساتھ اپنی عادلانہ حکومت شروع کی۔

نظام الملک محمد جنیدی وزیر اور بعض دیگر امراء نے مخالفت کی اور آمادہ جنگ ہوئے، لیکن رضیہ نے اپنے حسن تدبیر اور فطری شجاعت سے کام لے کر ان سب کو درہم و برہم کر دیا اور اپنی مخالف قوتوں کا استیصال تمام کر دیا۔

جو عزل و نصب اُس نے اپنی حکومت میں کئے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی مردم شناس تھی چنانچہ خواجہ

---

[1] طبقاتِ اکبری صفحہ ۱۳۔ [2] طبقاتِ ناصری صفحہ ۲۲۳ - جلد دوم

مہدی غزنوی کا تقرر (بجائے نظام الملک جنیدی کے) عہدۂ وزارت پر اور ملک سیف الدین ایبک کا نیابتِ لشکر پر اور سلطنت کے تمام دیگر حکام و امراء کا ایک مقام پر تبادلہ اس کی کافی شہادت ہے۔

جب تمام حکام اور صوبہ داروں کو رضیہ کی قوت اور اہلیت کا علم ہوگیا تو ساری مملکت میں لکھنوتی سے لیکر دیول تک تمام سرداروں اور امیروں نے سر اطاعت اس کے سامنے خم کر دیا[1]۔

منہاج السراج مصنف طبقات ناصری اسی کے عہد میں ناصریہ کالج سے متعلق ہوا اور گوالیار کا قاضی مقرر کیا گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رضیہ کیسی علم دوست اور ہنر شناس تھی۔

طبقات ناصری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں اسوقت معزی کالج موجود تھا جسکے دروازہ کو جامع مسجد کا دروازہ سمجھکر ملاحدہ کا گروہ اندر گھس آیا تھا[2]۔

رضیہ مردانہ لباس پہنتی تھی اور قبا و کلاہ کے ساتھ دربار کیا کرتی تھی۔ ہاتھی پر بھی سوار ہوتی تھی، لیکن گھوڑے کی سواری اُسے بہت پسند تھی۔ جنگ کے وقت فوج کی ترتیب خود کرتی تھی اور سب کے دوش بدوش میدانِ کارزار میں دادِ مردانگی دیتی تھی۔

رضیہ کے زوال کا سبب امیر جمال الدین یاقوت (حبشی) کو بتایا جاتا ہے جو میر آخور کے عہدہ پر ممتاز تھا اور رضیہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر گھوڑے پر سوار ہوا کرتی تھی۔ لوگ رضیہ کے اس انتخاب کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا خیال کرنا لوگوں کی زیادتی تھی جس کا کوئی ثبوت نہیں ہے[3]۔ حقیقت یہ ہے کہ قطب الدین ایبک اور شمس الدین کے عہد میں غلاموں کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی۔ التمش نے تو ترکی مملوکوں کا ایک دستہ ہی "چہل خانی" یا چہل گانی کے نام سے الگ کر لیا تھا جو التمش کے بعد بہت خود سر ہوگیا اور تمام امراء کو سخت تکلیف پہونچانے لگا۔ جب رضیہ کے عہد میں یاقوت "امیر الامراء" کے درجہ تک پہونچ گیا تو ترکی امراء کو ایک حبشی غلام کی ترقی ناگوار ہوئی اور اُس کی سیادت میں رہنا اُنھوں نے اپنے لئے باعث ذلت خیال کیا اس لئے اُن لوگوں نے بغاوتیں شروع کیں۔ انھیں باغیوں میں ملک التونیہ حاکم بھٹنڈا بھی تھا چنانچہ رضیہ خود اس کے مقابلہ کے لئے ۶۳۷ھ (۱۲۴۰ء) میں روانہ ہوئی۔ اس جنگ میں یاقوت حبشی مارا گیا اور رضیہ مقید ہو گئی لیکن رضیہ اس شکست کے بعد بھی کامیاب ہوئی اور ملک التونیہ نے اُس سے شادی کر لی۔

---

[1] طبقات ناصری جلد دوم صفحہ ۴۳۳۔ [2] طبقات ناصری نے اس واقعہ کو رضیہ کے ابتدائی عہد میں درج کیا ہے لیکن طبقات اکبری اور دیگر کتب تاریخ شمس الدین التمش کے آخری عہد میں اس کا وقوع ظاہر کرتے ہیں جن مورخین نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے اُن سب کا ماخذ زبدۃ التواریخ مصنفہ نور الحق ہے۔ [3] Medieval India by Lanepoole P. 75

اس کے بعد یہ دونوں دہلی کی طرف آئے کہ سلطنت پر دوبارہ قبضہ کر سکیں لیکن سلطان معز الدین (رضیہ کا بھائی) جو دہلی کا بادشاہ تسلیم ہو چکا تھا مقابلہ کے لئے بڑھا اور ان دونوں کو شکست دی۔ جب یہ بھاگ کر کیتھل پہونچے تو ان کا لشکر بھی منحرف ہو گیا اور آخر کار دونوں ہندوؤں کے ہاتھ گرفتار ہو کر قتل کر دئے گئے۔
۲۴ ربیع الاول ۶۳۸ھ کو شکست ہوئی اور ۲۵ ربیع الآخر کو رضیہ قتل ہوئی، اس نے تین سال ۶ دن حکومت کی۔

معز الدین بہرام شاہ

(۶۳۷-۶۳۹ھ / ۱۲۳۹-۱۲۴۱ء)

ہر چند رضیہ ۶۳۸ھ میں قتل ہوئی لیکن معز الدین بہرام شاہ تخت دہلی پر ۶۳۷ھ/۱۲۳۹ء ہی سے متمکن تھا، جب رضیہ کو سرہند میں شکست حاصل ہوئی۔

منہاج سراج نے اس کے صفات میں لکھا ہے کہ "وہ بیباک و خونخوار تھا لیکن اسی کے ساتھ حد درجہ بے تکلف اور باحیا طبیعت پائی تھی۔ وہ ظاہری شان و شوکت، آرائش و زینت سے گریز کرتا تھا اور وہ تمام مراسم تکلفات جو بادشاہوں کے دربار میں نظر آتے ہیں اُس نے ترک کر دیئے تھے"

جب یہ تخت نشین ہوا تو اختیار الدین اسی کے ساتھ نائب السلطنت بنایا گیا اور مہذب الدین کو وزارت کا عہدہ سپرد ہوا لیکن چند دن بعد بہرام شاہ اختیار الدین سے ناخوش ہو گیا اور آخر کار اس کو قتل کر کے ملک بدر الدین سنقر کو امیر حاجب مقرر کیا (۶۳۸ھ/۱۲۴۰ء) اسی سلسلہ میں وزیر مہذب الدین پر بھی حملہ کیا گیا لیکن وہ صرف زخمی ہو سکا۔

اس کے بعد بدر الدین سنقر نے خود بہرام شاہ کے خلاف ایک سازش شروع کی اور ارادہ کیا کہ اسے معزول کر دے لیکن وزیر مہذب الدین نے (جسے اس سازش میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی لیکن اُس نے بہ لطائف الحیل شرکت سے احتراز کیا) بادشاہ کو برمحل اطلاع دیدی اور اس نے وہاں پہونچکر مجمع کو منتشر کر دیا۔ اس کے بعد سنقر، بدایوں

---

[1] فرشتہ ۱-۶۹ [2] سنقر سے برہمی کی یہ وجہ بیان کیجاتی ہے کہ اُس نے معز الدین کی بہن سے شادی کر لی تھی علاوہ اس کے اپنے دروازہ پر دن میں تین بار نوبت بجواتا تھا اور وہاں ہر وقت ہاتھی جھوما کرتے تھے۔ اس شان و شوکت کو بہرام شاہ اچھی نگاہوں سے نہ دیکھتا تھا اسی لئے اُس کے درپئے آزار ہو گیا۔ [3] اس سازش کی وجہ یہ تھی کہ وہ وزیر مہذب الدین سے زیادہ اپنا اقتدار پیدا کرنا چاہتا تھا لیکن بہرام شاہ نے اس کا موقع نہیں دیا اور اس سے کچھ برہم ہو گیا۔ چنانچہ سنقر نے خود بادشاہ کے دفع کرنے کی تدبیر شروع کی۔

بھیجدیا گیا۔ اور بہرام شاہ کا اعتماد کسی پر نہ رہا۔ (۶۳۹ھ / ۱۲۴۱ء)

اسی اثناء میں مغلوں نے لاہور پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا[۱] اور وہاں کا گورنر اختیار الدین قراقش بھاگ کر دہلی چلا آیا بادشاہ نے نظام الملک مہذب الدین وزیر اور قطب الدین حسن وکیل سلطنت اور دیگر امراء کو اُن کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا لیکن یہ لوگ دریائے بیاس تک پہونچے تھے کہ مہذب الدین نے ایک خفیہ تحریر بادشاہ کے پاس روانہ کی کہ "جن امراء کو آپ نے میرے ساتھ روانہ کیا ہے وہ ناقابل اعتماد ہیں آپ خود تکلیف فرمائیں تو مناسب ہے" بادشاہ نے جواب میں لکھا کہ "واقعی یہ لوگ گردن مارنے کے قابل ہیں چند دن تم ان کے ساتھ مدارا رکھو پھر میں آکر ان سب کو سزا دوں گا" مہذب الدین نے یہ فرمان شاہی ان کو دکھا کر آمادۂ فساد کر دیا اور سب کے سب بجائے مغلوں کی طرف بڑھنے کے دہلی لوٹ آئے اور محاصرہ کر کے بتاریخ ۸ ذیقعدہ ۶۳۹ھ / ۱۲۴۲ء بہرام شاہ کو قتل کر دیا۔ اس نے صرف دو سال اور ڈیڑھ ماہ حکومت کی۔

علاء الدین مسعود شاہ

(۶۳۹-۶۴۴ھ / ۱۲۴۱-۱۲۴۶ء)

بہرام شاہ کے قتل کے بعد ہی ایک جماعت نے عز الدین بلبن کو جو التتمش کا داماد تھا بادشاہ منتخب کیا لیکن دن ختم ہونے سے پہلے دوسری جماعت نے جس پر بعد کو اکثر کا اتفاق ہو گیا۔ علاء الدین مسعود (رکن الدین فیروز کے بیٹے) کو تخت نشین کر دیا۔ اس کے عہد کے خاص خاص واقعات یہ ہیں :۔

خاص خاص واقعات کی تفصیل

۸ ذیقعدہ ۶۳۹ھ / ۱۲۴۲ء	مسعود شاہ تخت نشین ہوا۔
۱۲ جمادی الاول ۶۴۰ھ / ۱۲۴۲ء	وزیر مہذب الدین نے امراء ترک کے ہاتھوں سے تمام کام نکال لئے تھے اس لئے اُنھوں نے اسے قتل کر دیا۔
۶۴۱ھ / ۱۲۴۳ء	منہاج سراج طبقات ناصری نے عہدۂ قضا سے استعفا دیا اور ۹ رجب کو طوغان خاں والیِ بنگال کے دربار میں حاضر ہونے کے لئے روانہ ہوا۔ لکھنوتی میں یہ دو سال تک رہا۔ انھیں دو سال کے عرصہ میں مسعود شاہ نے توسیع سلطنت کی طرف توجہ کی[۲] اور اپنے

[۱] منہاج سراج نے قبضہ لاہور کی تاریخ ۱۶ جمادی الثانی ۶۳۹ھ کی تحریر کی ہے اور تاریخ الفی میں ۶۳۸ھ تحریر ہے۔ [۲] منہاج سراج کے الفاظ یہ ہیں :۔ "درین دو سال سلطان علاء الدین را در اطراف ممالک فتوح را بسیار بود۔"

دونوں چچا جلال الدین اور ناصر الدین کو قید سے آزاد کرکے قنوج و بہرائچ اُن کی جاگیر مقرر کی گئی۔

شوال ۶۴۲ھ / ۱۲۴۵ء — راجہ جاج نگر نے لکھنوتی پر حملہ کیا اور غرۂ ذیقعدہ میں تمرخان قیران سلطان علاء الدین کے حکم سے فوج لیکر لکھنوتی پہونچا اور بعد کو یہی لکھنوتی کا فرمانروا تسلیم کیا گیا۔ اسی سال غیاث الدین بلبن امیر حاجب مقرر کیا گیا۔ (اس وقت یہ الغ خاں کے نام سے مشہور تھا)

۱۳؍ صفر ۶۴۳ھ / ۱۲۴۵ء — منہاج سراج، دہلی واپس آیا اور اپنے سابقہ عہدہ پر بحال ہوا۔

رجب ۶۴۳ھ / ۱۲۴۶ء — مغلوں نے منگوخاں کی سرکردگی میں اوچھ پر حملہ کیا مسعود شاہ خود مقابلہ کے لئے روانہ ہوا لیکن مغل اُسکے پہونچنے سے قبل واپس چلے گئے۔

۶۴۴ھ / ۱۲۴۶ء — مسعود شاہ کی صحبت میں چند نااہل لوگوں کو درخور حاصل ہوگیا اور اُس نے جبر وظلم، عیش و عشرت لہو و لعب میں اپنے اوقات صرف کرنے شروع کئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں بدامنی کے آثار نظر آنے لگے اور امراء نے مجبور ہوکر اس کے چچا ناصر الدین کو بلایا اور بتاریخ ۲۳ محرم اُسے قید کرکے ناصر الدین کو تخت نشین کر دیا۔

ناصر الدین محمود شاہ

(۶۴۴ - ۶۶۴ھ / ۱۲۴۶ - ۱۲۶۵ء)

مسعود شاہ کے بعد ناصر الدین محمود بن شمس الدین تخت نشین ہوا جو غلام خاندان میں خاص امتیاز رکھتا ہے۔ یہ التمش کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا اور اس کی تعلیم و تربیت میں حد درجہ کوشش کی گئی تھی۔ سلطان مسعود شاہ کے

لہ اس واقعہ کے متعلق مورخین نے سخت غلطی کی ہے۔ فرشتہ، نظام الدین احمد، ملا عبدالقادر اور دیگر مورخین نے بیان کیا ہے کہ ۶۴۲ھ میں مغلوں نے لکھنوتی پر حملہ کیا اور طبقات اکبری میں تو اُن کا راستہ بھی متعین کر دیا ہے کہ وہ تبت کی راہ سے بنگالہ پہونچے بعض مغربی مورخین (مثلاً الفنسٹن وغیرہ) نے بھی یہی غلطی کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس غلطی کا اصل ماخذ طبقات ناصری ہے جس میں لکھا ہے کہ "در شوال سنہ اثنا واربعین دست آوہ کفار چنگیز خاں بدر لکھنوتی آمدند" لیکن حقیقت یہ ہے کہ بجائے جاج نگر کے چنگیز خاں غلطی سے تحریر ہوگیا ہے۔ طبقات کا جو نسخہ کلکتہ میں باہتمام کپتان ناسولیس صاحب ۱۸۶۴ء میں شایع ہوا ہے اس میں بھی متن کے اندر چنگیز خاں لکھا ہے لیکن حاشیہ پر جاجنگر بطور نسخہ کے تحریر ہے۔ مسٹر اڈورڈ طامس نے البتہ اس غلطی کو محسوس کرکے اپنی تاریخ کو اس سے محفوظ رکھا ہے۔

عہد میں ولایت بہرائچ اس کے سپرد تھی اور اسی وقت سے اس کے افسانہ ہائے عدل و رعیت پروری تمام ملک میں مشہور تھے، چنانچہ مسعود شاہ کے انتقال پر تمام امراء و اعیان نے قصرِ سفید میں تخت شاہی پر اس کو متمکن کیا اور شعراء نے قصائد تہنیت پیش کر کے بیش بہا انعامات حاصل کئے۔ منہاج سراج نے اپنی مشہور تاریخ کو اس بادشاہ کے نام سے منسوب کر کے اُس کا نام طبقات ناصری رکھا[1] اور اس کے حالاتِ حکومت پندرہ سال یعنی ۶۵۸ھ تک نہایت تفصیل کے ساتھ لکھے۔

ناصر الدین علاوہ عادل و شجاع ہونے کے حد درجہ عابد و مرتاض تھا۔ خزانہ شاہی سے ایک پیسہ بھی اپنے اوپر صرف نہ کرتا تھا اور صرف کلام مجید لکھ کر اپنا نفقہ حاصل کرتا تھا۔[2]

ابن بطوطہ مشہور سیاح نے ناصر الدین کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن خود دیکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

"قاضی کمال الدین نے مجھے ایک نسخہ بادشاہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیا جو نہایت خوشخط تھا۔"[3]

نظام الدین احمد کے حوالہ سے فرشتہ نے لکھا ہے کہ:۔

"وہ ہر سال دو مصحف کی کتابت کرتا۔ ایک بار اُس کا قلمی مصحف کسی امیر نے زیادہ قیمت دیکر خرید لیا سلطان کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو اُسے ناگوار ہوا اور آیندہ کے لئے حکم دیا کہ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا کلام مجید خفیہ طور سے بازار کی معمولی قیمت پر فروخت کیا جائے۔"

سلطان ناصر الدین صرف ایک منکوحہ بی بی رکھتا تھا اور کوئی خادمہ وغیرہ نہ تھی۔ ایک دن بی بی نے شکایت کی کہ میرے ہاتھ روٹی پکاتے پکاتے جلے جاتے ہیں اگر کوئی کنیز لے لی جائے تو کیا حرج ہے۔" سلطان نے جواب دیا کہ:۔

"بیت المال بندگان خدا کا حق ہے میں اس میں سے کچھ صرف نہیں کر سکتا ورنہ کوئی کنیز مہیا کر دیتا۔"[4]

ناصر الدین دوسرے کے جذبات کا بہت لحاظ کرتا تھا اور کبھی کسی کو تکلیف پہونچانا یا مایوس کرنا پسند نہ کرتا تھا۔ ایک بار وہ کلام مجید کی تلاوت کر رہا تھا کہ ایک شخص اجنبی آگیا اور بولا کہ "لفظ فیہ مکرر لکھا ہوا ہے۔" سلطان نے فوراً اُس لفظ کے گرد قلم سے حلقہ کھینچ دیا اور اُس شخص کا حال پوچھ کر رفع حاجت کر دی۔ جب وہ چلا گیا تو پھر قلم تراش سے اُس حلقہ کو مٹا دیا۔ ایک غلام نے دریافت کیا کہ حلقہ کھینچنے اور پھر اُس کے محو کر دینے کا کیا سبب تھا؟ بادشاہ نے جواب دیا کہ "یہ شخص اپنی حاجت لیکر آیا تھا اگر میں اُس سے کہدیتا کہ لفظ فیہ غلط تحریر نہیں ہوا تو وہ نادم ہو جاتا اسلئے میں نے حلقہ کھینچ دیا کہ اس کا محو کر دینا بہ نسبت غبار ملال رفع کرنے کے زیادہ آسان ہے۔"

مذہب کا وہ حد درجہ احترام کرتا تھا اور عظمت نبوی کے خیال سے ہر وقت کانپتا رہتا تھا۔ اس کا ایک ندیم تھا جس کا نام محمد تھا۔ سلطان ناصر الدین جب اس کو بلاتا تو ہمیشہ نام لیکر پکارتا اور جو کام ہوتا کہدیتا۔ ایک دن تاج الدین کہکر آواز دی

---

[1] فرشتہ صفحہ ۷۰،۱ــ [2] فرشتہ صفحہ ۷۱ــ [3] ایلیٹ جلد سوم صفحہ ۵۹۳ ــ [4] طبقات اکبری صفحہ ۳۷ــ

معلم اکبر نے اس کو گلے سے لگالیا اور اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا کہ "بیشک یہی ہونا چاہئے اور میں ضرور تیری خواہش پوری کروں گا" اس کے بعد وہ نسیم کی طرف مخاطب ہوا اور کوئی بات اس کے کان میں کہی۔ نسیم فوراً فضا میں بلند ہوگیا اور کچھ دیر ہمارے سروں پر منڈلا کر کرۂ مریخ کی طرف رُخ کر کے روانہ ہوگیا۔

معلم اکبر نے صرصر سے مخاطب ہوکر کہا کہ "عساکر نور کی تعداد یقیناً بڑھنا چاہئے اور اُسے منظم ہوکر جدید ترین آلات و اسباب سے آراستہ ہونا چاہئے ورنہ افواج تاریکی پر غالب آنا مشکل ہوگا"

صرصر نے عرض کیا کہ "کیا مجھے کرۂ مریخ جانے کی اجازت مل سکتی ہے تاکہ میں وہاں پہونچکر محبت و اخوت کا درس لوگوں کو دوں اور باطل کے خلاف جماعت حقہ کو منظم کر کے امن و سکون کی تبلیغ کروں"

معلم اکبر نے جواب دیا کہ "ابھی تیری روانگی کا وقت نہیں آیا کیونکہ بہت سے اُصول ہنوز سکھانے باقی ہیں، لیکن سچ بتا کیا تو واقعی اپنے ابنائے جنس کے دلوں کو محبت و اخوتِ عامہ کی روشنی سے معمور کرنا چاہتا ہے"

صرصر نے کہا "اے میرے مرشد و ہادی، میری تو رات دن یہی التجا ہے اور سوتے جاگتے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال دل سے محو نہیں ہوتا"

جامِ زر بولا کہ "اے آقا، میں نے بھی اپنی زندگی صرف اس کوشش کے لئے وقف کر دی ہے کہ کائنات کا انتظام امن و سکون کے سوا اور کسی چیز پر قایم نہ ہو اور عمومی رشتۂ اخوت استوار کر کے ایک ایسے نظم حکومت کی بنیاد ڈالی جائے جس کا نام "مملکتِ متحدۂ سیارگان" ہو"

یہ سنکر میں بے اختیارانہ "جامِ زر" سے ہم آغوش ہوگیا اور معلم اکبر بھی انتہائی تاثر کے ساتھ بولا کہ "اے جامِ زر، اس میں شک نہیں کہ جس مقصد کا اظہار تو نے کیا ہے، عین وہی میرا مدعا ہے اور قدرتِ عظمیٰ کا مقصود حقیقی" اس کے بعد اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ـــ "کیا تو سمجھتا ہے جو جامِ زر نے کہا اور کیا تو اپنے کرۂ ارض میں اس مقصد کی ترویج کے لئے آمادہ ہے"

میں نے کہا کہ "جامِ زر نے اسوقت وہ بات کہی ہے جو میری روح میں گونج رہی تھی لیکن الفاظ سے میں اسے ظاہر نہ کر سکتا تھا، میں تو ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ زندگی کا صحیح نصب العین میرے ہاتھ آگیا ہے اور میں بیتاب ہوں کہ کس طرح کرۂ ارض پر پہونچکر اس تحریک کی اشاعت کروں ـــــ "ممالک متحدۂ سیارگان" !ـــ کتنا عجیب و غریب خیال ہے کتنی مقدس و پاکیزہ بات ہے۔ اگر اس کی تبلیغ میں میری جان بھی کام آجائے تو میں سمجھوں گا کہ زندگی ٹھکانے لگ گئی"

یہ سُنکر معلم اکبر کے چہرہ سے غیر معمولی مسرت کے آثار ظاہر ہونے لگے اور میں خود اپنے تاثرات میں گم ہوکر رہ گیا۔

باب (۶)

دلآرام

جامِ زر اور دلآرام کے ساتھ میرے تعلقات اتنے گہرے ہو گئے تھے کہ میری ہر سانس گویا انھیں کے جسم سے چھو چھو کر نکلتی تھی۔ میں جب دلآرام کو دیکھتا تو میرا قلب شدت جذبات سے اُچھلنے لگتا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ معطر نسیم سحر کی طرح میری روح کے اندر نفوذ کر گئی ہے اور اگر کبھی اس کا یہ اثر زایل ہو گیا تو میں مر جاؤں گا۔

اس میں تین صفتیں نہایت عجیب و غریب پائی جاتی تھیں، آزادی، جرأت اور صداقت۔ اور ان تینوں کا امتزاج اسقدر توازن کے ساتھ پایا جاتا تھا کہ کرۂ ارض میں مجھے کہیں نظر نہ آیا تھا۔ اسکی ذہنی و اخلاقی جرأت کے سامنے میں کانپ کانپ اُٹھتا تھا اور اس کی صداقت کا یہ عالم تھا گویا ایک شفاف آئینہ ہے جس میں مجھے اپنا سراپا نظر آرہا ہے۔

جامِ زر بڑا دانشمند تھا، غیر معمولی دانشمند! غالباً سیارۂ کوکب الدجاجہ کی آبادی جہاں سے وہ آیا تھا، ذہنی حیثیت سے بہت ترقی کر چکی تھی اور اس کی روحانی تہذیب درجۂ کمال کو پہونچ چکی تھی۔

جامِ زر کی معلومات اتنی وسیع و عمیق تھیں گویا وہ ایک روحانی "دائرۃ المعارف" تھا اسلئے میں نے اسے ہر مسئلہ میں اپنا مشیر و رہبر بنا لیا تھا۔ اپنی غیر معمولی فراست کے ساتھ وہ حد درجہ منکسر مزاج بھی تھا اور سادگی پسند بھی۔ جب تک وہ خاموش رہتا تو یہ معلوم ہوتا کہ اس کو عالم و کاروبارِ عالم کی خبر ہی نہیں لیکن جب گفتگو پر آمادہ ہو جاتا تو ایک "دنیائے آگاہی" نظر آنے لگتا۔ مجھکو اسی کی صحبت میں سب سے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ تکمیلِ حسن کیا چیز ہے اور "حسنِ تکمیل" کسے کہتے ہیں۔

ایک دن ہم تینوں آبشار بہجت کے قریب ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے کہ وہ میری طرف مخاطب ہوا "تمھیں معلوم ہے کہ معلم اکبر ایک مرکزِ روحانی کی حیثیت رکھتا ہے جس سے روحانی شعاعیں نکل نکل کر چاروں طرف پھیل رہی ہیں، جن کی ہم کو جستجو ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جب تک ہم مرکز سے وابستہ نہ رہیں گے کامیابی دشوار ہے"

میں نے کہا۔ "اس کی کیا صورت ہے"

اسنے جواب دیا۔ "صرف یہ کہ سوائے تکمیل کے اور کوئی مقصد اپنا قرار ہی نہ دو"

میں نے پوچھا۔" تکمیل سے کیا مراد ہے اور اس کے حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے"

اس نے کہا۔" اس کی صورت صرف یہ ہے کہ اپنے ابنائے جنس کے ہر ہر فرد اور دنیا کے ہر ذی حیات سے محبت رکھو اور تمھاری زبان سے وہی بات نکلے جو تمھارے دل میں ہے۔"

دلآرام بولی۔ " اور لوگ اسے نہ سمجھیں تو؟"

جام زر نے کہا۔ " نہ سمجھنے دو، کچھ پرواہ نہیں۔ تمھیں بہر حال ان سے محبت ہی کرنا ہے۔ دنیا میں محبت کرنا نفرت کرنے سے زیادہ آسان ہے۔ اگر تمھارے ساتھ کوئی برا سلوک کرتا ہے تو تم اس کا جواب برائی سے نہ دو اور اسے معاف کر دو۔"

میں نے کہا۔" کرۂ زمین میں تو اس خیال کے لوگ شاذونادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔"

وہ بولا ۔ " ہاں، تمھارا کرۂ زمین ابھی تک مادرِ زمانہ کے رحم ہی کے اندر پرورش پا رہا ہے اور ابھی تک یہ جنین کے باہر نہیں آیا۔ میرے کرہ میں تو ہر شخص اسی اصول پر کاربند ہے۔ یاد رکھو کہ ایک سچا ہادی کسی کو حکم نہیں دیتا ہے بلکہ رہنمائی کرتا ہے۔ وہ اپنے خیالات کی اشاعت جبر و سختی سے نہیں کرتا بلکہ صلح و آشتی سے، اُلفت و محبت سے۔ وہ خود کچھ نہیں کہتا لیکن اس کی روح کے اندر سے نکلنے والی روشنی خود شاہراہ حیات کو متعین کر دیتی ہے۔

یاد رکھو کہ تمھارا اصول کار بھی ہمیشہ محبت ہی ہونا چاہئے، آسمانی سلطنت جسے تم دنیا میں قائم کرنا چاہتے ہو ایک فردوس حقیقت ہے، ایک بہشت صداقت ہے، ایک گلستانِ نشاط ہے۔ تم لوگوں کی ان کی ایک جھلک دکھاؤ اور وہ خود جوق در جوق اس کے اندر آ جائیں گے۔"

میں نے کہا کہ " اکثر رہنماؤں میں یہ عادت پائی جاتی ہے کہ وہ قدیم دیرینہ روایات کے پابند ہوتے ہیں، وہ ماضی کی عزت ایک مقدس مذہب کی حیثیت سے کرتے ہیں اور قدیم مصلحین کے خیالات سے سرمو تجاوز کرنا پسند نہیں کرتے گویا اُنکے دل و دماغ بوسیدہ مزار ہیں جن میں قدما کی ہڈیاں مدفون ہیں"۔

جام زر نے کہا۔" یہ بالکل درست ہے، ہر شخص نے اپنا روحانی نقطۂ نظر علیحدہ مقرر کر لیا ہے اور اسی کی پاسداری کرتا ہے، لیکن ہم کو "بہترین" کی تلاش "قدیم ترین" میں نہ کرنا چاہئے، بلکہ نگاہ ہمیشہ آگے رکھنا چاہئے تاکہ ہم میں مستقبل کے اندر نفوذ کر جانے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ زمانۂ قدیم کی توہین کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے کیونکہ جو مصلح جس زمانہ میں ہوا وہ اپنے عہد کے لحاظ سے اتنا ہی کر سکتا تھا جتنا اس نے کیا۔ ہم کو چاہئے کہ ماضی کی اُن تمام آرزؤں کو جو پوری نہیں ہو سکی ہیں پورا کر کے دکھا دیں، مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہمارا نظریۂ عمل اور ہمارا رجز صرف یہ ہو کہ "آگے بڑھو — آگے بڑھو"

میں جام زر کی گفتگو سے اسقدر مسحور تھا کہ یہ بھی یاد نہ رہا تھا وہ یہاں ہے یا نہیں لیکن اس کے آخری فقرہ نے ہم دونوں کو چونکا دیا۔ اب ہمارے کانوں میں ہر چار طرف سے یہی آواز آرہی تھی کہ

"آگے بڑھو۔ آگے بڑھو"

میں نے اس سے سوال کیا کہ "اس آسمانی سرزمین میں یہ کہدینا آسان ہے، لیکن یہ بتاؤ کہ جس وقت ہم اپنے اپنے کروں میں پہونچیں گے اور یہ پیام سنائیں گے تو کیا یہ لوگوں کے دلوں پر تیر کا سا کام نہ دے گا اور قدامت کے دفتر پارینہ میں اس سے آگ نہ لگ جائے گی۔ پھر اسوقت ہمیں کون سنبھالے گا، کون ہمیں مشورہ دے گا؟"

یہ سنکر وہ بالکل خاموش رہا، اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ کا رنگ متغیر ہو رہا تھا لیکن "آگے بڑھو۔ آگے بڑھو" کی آواز بدستور میرے کانوں میں آرہی تھی۔

دلآرام کی حالت عجیب تھی، کچھ دیر تو وہ بھی خاموش رہی لیکن پھر وہی نعرہ لگاتی ہوئی جھیل کے کنارے رقص کرنے لگی۔

جام زر نے مجھ سے کہا "تم نے دیکھا، ایک قاید و رہنما میں اُس جوش و ولولہ کی ضرورت ہے جو دلآرام میں پایا جاتا ہے، میں بہت ضعیف ہو گیا ہوں اس لئے یہ چیز مجھ سے مفقود ہو گئی ہے، تم ابھی نوجوان ہو اور یہ جوش عمل اپنے اندر پیدا کر سکتے ہو اگر واقعی یہ لگن دل میں لگ جائے۔"

اتنی دیر میں دلآرام رقص کناں پھر واپس آئی اور بولی کہ "آؤ میں تمھیں بتاؤں کہ ہم اپنا مقصد کیونکر حاصل کر سکتے ہیں۔"

دلآرام آگے آگے تھی اور ہم اس کے پیچھے۔ یہ ہمیں بالکل معلوم نہ تھا کہ آج ایک جلسہ منعقد ہونے والا ہے جس میں معلم اکبر کی طرف سے دلآرام کو تقریر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

جلسہ میں پہونچنے کے بعد مختصر الفاظ میں معلم اکبر نے دلآرام کا تعارف حاضرین سے کرایا اور اسکے بعد اس نے اپنی تقریر شروع کی:۔

"اے کائنات کی عورتو، میں تمھیں تمھاری اُن بہنوں کی طرف سے جو کرۂ زہرہ میں رہتی ہیں سلام پہونچاتی ہوں، کیونکہ ہم سب ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں اور ہمارے اغراض و مقاصد ایک ہیں۔

آپ کو معلوم نہیں کہ زہرہ کی عورتیں کتنے زمانہ سے آزادی کے لئے جنگ کر رہی ہیں۔ آزادی ہر انسان کا فطری حق ہے۔ ہمارا خدا مہربان آقا کی حیثیت رکھتا ہے نہ کہ ظالم بردہ فروش کی سی۔ آزادی کی حمایت خدا کی حمایت ہے اور زہرہ کی عورتوں کا مذہب آزادی اور صرف آزادی ہے۔ وہ سوائے آزادی کے کسی چیز کی طلبگار نہیں اور ان کی روحیں اسی گوہر گم گشتہ کے لئے بیتاب ہیں۔

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جسمیں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

قیمت تین روپیہ (سے) علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مجموعۂ استفسار و جواب ۳ جلد

ان تینوں جلدوں میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۳۶ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی، مسایل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ہے۔

قیمت فی جلد تین روپیہ (سے) علاوہ محصول

خریداران نگار سے فی جلد ایکروپیہ کم

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲/)

خریداران نگار سے تین آنہ (۳/) کم

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:۔

۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

۲۔ مادئین کا مذہب۔

۳۔ حرکت کے کرشمے۔

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴/) کم

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ، حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰/)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے دو آنہ (۲/) کم

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴/) کم

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اسکو شروع کر دینا آخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنے (۱۲/)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے تین آنہ (۳/) کم

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیائے تہذیب و شایستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اُردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (عـ/)

علاوہ محصول
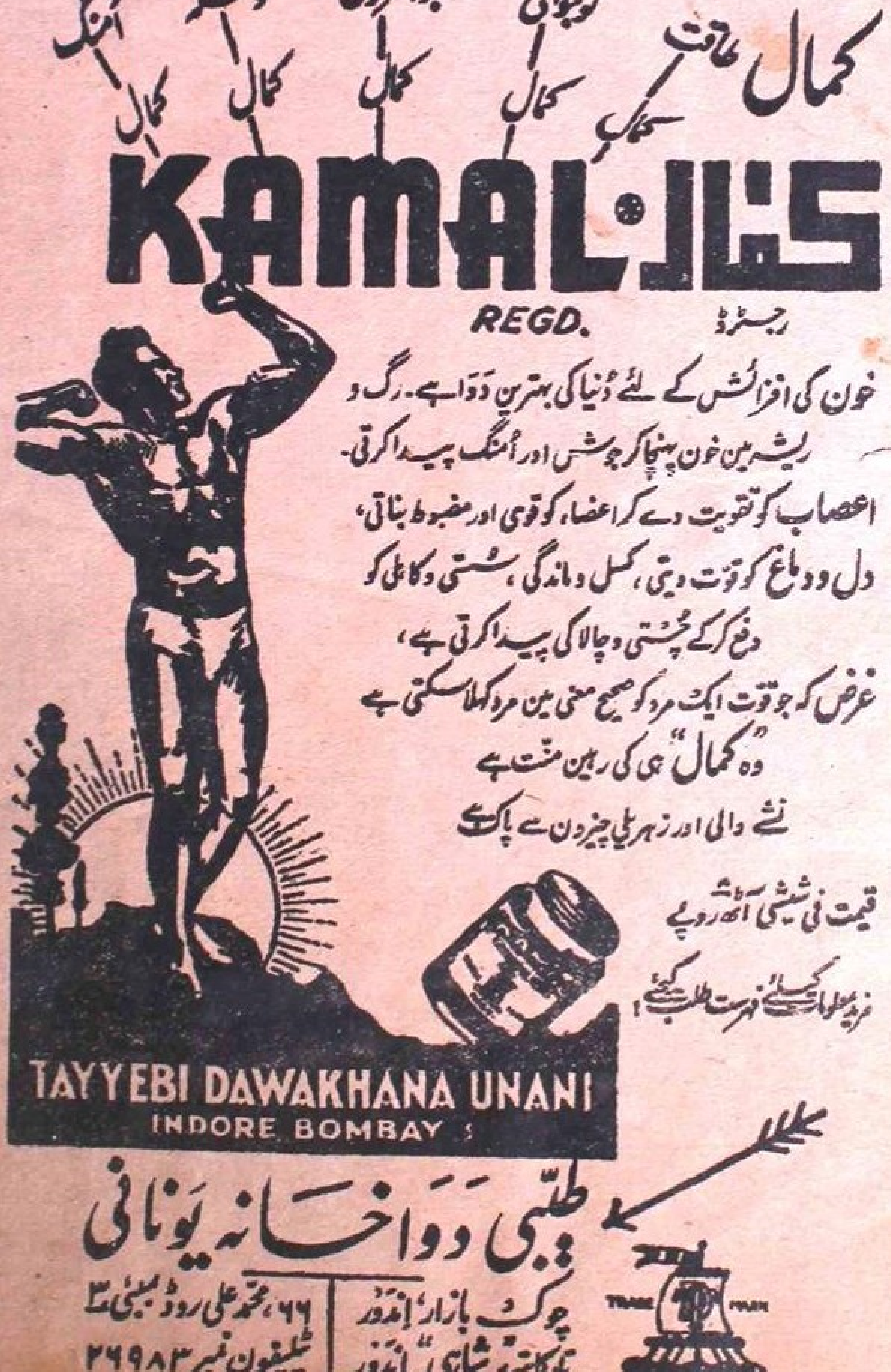
رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴